بالادست

(افسانے)

نوشابہ خاتون

بالادستؔ

(افسانے)

نوشابہ خاتون

ثالث پبلیکیشنز
شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

☆ اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔
☆ کتاب میں شائع مواد سے بہار اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
☆ کسی بھی قابل اعتراض مواد کی اشاعت کے لئے خود مصنفہ/مرتب ذمہ دار ہے۔

ابّا

سید محمد صالح (مرحوم)

کے نام

جن کی شفقتوں کو میں کبھی بھلا نہیں سکتی

BAALA-DAST
(SHORT-STORIES)
by
NAUSHABA KHATOON

نام کتاب	:	بالادست
مصنفہ	:	نوشابہ خاتون
پتہ	:	۴۰۶/۴ لوچن انکلیو، کنکڑ باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۲۰
فون	:	0612-2365399
موبائل	:	(0)9693347545
سنہ اشاعت	:	2009
تعداد اشاعت	:	چارسو
قیمت	:	Rs.200=00
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	ثالث کمپیوٹرس، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر ۸۱۱۲۰۱
طباعت	:	پرنٹ ورلڈ، سرائے جولینا، نیو فرینڈس کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
موبائل نمبر	:	+91-9811541464

اہتمام : اقبال حسن آزاد

☆

ملنے کے پتے

☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
☆ ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر ۸۱۱۲۰۱
☆ نوشابہ خاتون، ۴۰۶/۴ لوچن انکلیو، کنکڑ باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۲۰

☆☆☆

فہرست

☆☆☆

نوشابہ خاتون.....فن کی نقیب

عبدالصمّد

نوشابہ خاتون نے اگرچہ قدرے تاخیر سے لکھنا شروع کیا مگر ان کی تحریروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر لکھنے لکھانے کی صلاحیت خداداد ہے۔شاید کچھ ناگزیر اسباب سے یہ جوہر کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ان کے افسانوں، خاص طور پر ''بالا دست'' اور ''سائبان'' میں ان کا یہ جوہر بلندیوں کو پہنچ گیا ہے۔

نوشابہ خاتون ایک گھریلو خاتون ہیں اور اندازہ یہی ہے کہ گھر کی چہار دیواری کے اندر رہتے ہوئے شاید انھیں دنیا کے نشیب و فراز، مکر و فریب، انسانی زندگی کے غیر معمولی تضاد، ساتھ ہی ساتھ محبت و خلوص، سچی انسانی ہمدردی اور بے لوث جذبات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔لیکن ان کے افسانے پکار پکار کر کہتے ہیں کہ انھیں زندگی کی تمام نزاکتوں، باریکیوں، ہولناکیوں اور سفاکیوں کا بہ خوبی علم ہے اور وہ انھیں اپنے افسانوں میں کامیابی کے ساتھ برتنا بھی جانتی ہیں۔

زبان و بیان پر گرفت، افسانوں کی بنت، فن کی حرمت اور قدروں کے تئیں Commitment.....یہ خصوصیات چند دنوں میں نہیں آتیں، اسکے لیے برسوں ریاض کی ضرورت ہوتی ہے اور بسا اوقات اس کے بعد گرفت میں نہیں آتیں۔نوشابہ خاتون اس معاملے

میں خوش قسمت ہیں کہ انھیں فن کا شعور ودیعت ہوا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنے اس فن کا کیسے اور کیوں کر استعمال کرتی ہیں۔

"افسانہ" پرامید نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

☆☆☆

نوشابہ خاتون کے افسانے

حیدر قریشی

مدیر ''جدید ادب'' جرمنی

نوشابہ خاتون کے افسانوں کا مجموعہ ''بالا دست'' اپنے موضوعات کے لحاظ سے میرے لیے خاصی دلچسپی کا موجب بنا ہے۔ کچی عمروں کے نیک پاک احساسات سے لے کر رومانوی جذبات تک پھیلی ہوئی جو کہانیاں ہیں ان میں ایک خاص نوع کی اور خواتین سے مخصوص رومانی کیفیت تو ملنا ہی تھی۔ تاہم نوشابہ خاتون نے ان موضوعات سے آگے بڑھ کر کئی اہم سماجی و اخلاقی مسائل پر بھی اپنے انداز میں بات کی ہے۔ انہوں نے جھونپڑی کے باسیوں کی زندگی بھی قریب سے دکھائی ہے اور حویلیوں کے اندر بھی جھانکا ہے۔ گھریلو زندگیوں میں آنے والے اتار چڑھاؤ اور دکھ کی حالت میں امید کا دامن تھام کر آگے بڑھنا، ان کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔ تاہم کہیں کہیں ان کی کہانیوں کا کوئی کردار اپنے دکھ سے ہار کر خودکشی بھی کر جاتا ہے۔ عملی زندگی میں بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے نوشابہ خاتون کی کہانیاں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی بھی کرتی ہیں اور ایک مثالی زندگی کا احساس بھی دلاتی ہیں۔

سماجی مسائل میں نوجوان بیوہ کی شادی اور اس سے متعلق دنیا والوں کی باتیں

نوشابہ نے اچھے پیرائے میں بیان کی ہیں۔ یہاں اخلاقی مسائل سے بچنے کی احسن صورت ہے تو ایک اور طرف نانا جان کی نوجوان لڑکی سے شادی کے نتیجہ میں ''دور کے رشتہ میں نواسے'' کے ساتھ اخلاقی مسئلہ کو بھی بڑی دلیری کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

امارت اور غربت کے بڑھتے ہوئے فرق کو بھی نوشابہ خاتون نے اپنے انداز سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ غریبوں کے باہمی تنازعات کی اس وقت آخری حد آجاتی ہے جب دو گداگر بھیک مانگنے کے لیے زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر قبضہ کرنے کے لیے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ ایک گداگر اپنی بیٹی کو جہیز میں دینے کے لیے بھیک مانگنے کا اڈہ دینا چاہتا ہے تاکہ پھر وہاں اس کا داماد اپنا بھیک مانگنے کا کاروبار جاری رکھ سکے۔ ہے نا مزے کی بات!

تو نوشابہ خاتون کی کہانیوں میں ایسی مزے مزے کی باتیں بھی موجود ہیں۔

کچے پکے جذبات واحساسات اور رومانوی دنیا سے گزرتے ہوئے نوشابہ خاتون نے عملی زندگی کے مختلف النوع حقائق کو اپنے اظہار کا موضوع بنایا ہے۔ اس ایک مجموعے میں ان کی افسانہ نگاری کے سفر کا یہ مرحلہ پورا ہو گیا ہے۔

نوشابہ خاتون کے اس مجموعہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے میں اس امید کا اظہار کرتا ہوں کہ ادبی دنیا میں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ ان کا اگلا افسانوی مجموعہ اپنے اظہار کی پختگی کے ساتھ زندگی کے مزید موضوعات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوگا۔ موضوعات کے حوالے سے مجھے کوئی مشورہ نہیں دینا کہ اس کے چناؤ میں نوشابہ خاتون بذاتِ خود نہ صرف بہتر صلاحیت رکھتی ہیں بلکہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں۔

میں ان کی ادبی کامیابیوں کے دعا گو ہوں!

☆☆☆

نوشابہ خاتون کا فن

اقبال حسن آزاد

علامہ اقبال نے فرمایا ہے:

رنگ ہو یا سنگ وخشت، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

یہ خونِ جگر نوشابہ خاتون کے فن میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ موصوفہ کے فن پر گفتگو کی جائے، میں یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ ان کے خاندانی پسِ منظر پر تھوڑی بہت روشنی ڈال لی جائے تاکہ ان کے فن کی باریکیاں زیادہ بہتر طور پر سامنے آسکیں۔

نوشابہ خاتون ایک ذی علم خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور علم وفن انھیں وراثت میں ملا ہے۔ مگر اس قصے کا تاریک پہلو یہ ہے کہ آج سے نصف صدی پہلے تک عام مسلمان گھرانوں میں مرد خواہ کتنے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں، عورتوں اور لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ انہیں صرف گھر پر قرآن شریف کی تعلیم دے دی

جاتی تھی اور تھوڑی بہت اردو پڑھا دی جاتی تھی۔ لہذا نوشابہ خاتون بھی بس واجبی تعلیم ہی حاصل کر سکیں۔ لیکن یہ ان کی خداداد ذہانت اور گھر کے علمی ماحول کا نتیجہ ہے کہ انہیں اپنے قلم پر عبور حاصل ہو گیا:

خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے

بہر کیف! نوشابہ خاتون بھی چپکے چپکے پڑھتی لکھتی رہیں اور اپنے جذبات و احساسات کو خاموشی کے ساتھ قلم بند کرتی رہیں۔ کسی کو اس کی کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ اس دوران ان کی زندگی کئی نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے جب ذرا پر سکون ہوئی تو ان کا فن اچانک..... بالکل اچانک دنیا کے سامنے کھل کر آ گیا۔

''دیکھو تو ذرا! یہ میں نے لکھا ہے۔ کیا یہ افسانہ ہو گیا؟'' ایک دن اُنھوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے کہا۔ میں بڑا حیران ہوا۔ پھر میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے ان کے ہاتھ سے ان کا افسانہ لے لیا۔ حیرت..... حیرت۔ میں جیوں جیوں پڑھتا گیا میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ افسانہ اپنی مکمل شکل میں میرے سامنے تھا۔ قصہ، پلاٹ، مکالمے، فضا آفرینی، جذبات نگاری اور ایک منطقی انجام یعنی کلائمکس۔

پھر تو سلسلہ نکل چلا۔ اپنے فن کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں نوشابہ خاتون جتنا خونِ جگر صرف کرتی ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ نتیجتاً ان کا فن رفتہ رفتہ نکھرتا گیا اور اب میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ موصوفہ اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔

آپ ان کے افسانے شروع سے آخر تک پڑھ جائیں۔ شکوہ، سائبان، بالادست، پکھیرو، ہونی انہونی، احساس کی قیمت، احساس کی آواز، دلدل، نقار خانہ اور حاصل زندگی وغیرہ۔ ہر جگہ قاری کی تسکین کا پورا سامان موجود ہے۔ ''حاصل زندگی'' تو

اس مجموعے کا حاصل ہے۔ اتنا compact، رچا اور گٹھا ہوا افسانہ تخلیق کرنے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہے۔

نوشابہ خاتون کے فن کا ایک خاص وصف ان کا خوبصورت بیانیہ ہے۔ یہ غالباً ان کے خاندانی پسِ منظر کی دین ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے الفاظ ایک خوبصورت ڈھانچے میں ڈھلے ڈھلائے ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور وہ جیسے چاہتی ہیں، انکا استعمال کرتی ہیں۔ ایسی روانی اور برجستگی بعض ''کہنہ مشق'' افسانہ نگاروں کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

''اے خدا تو کہاں ہے؟ جاگتا ہے یا سوتا ہے؟ کیا تو اپنے بندوں کے شر سے عاجز آ گیا ہے؟؟؟ ذرا آنکھیں کھول اور اس ناچیز پر ایک نظر کرم ڈال۔ تو نے مجھے کیوں بھلا دیا؟ کیوں نظر انداز کر دیا؟ یہ نہ سوچا کہ تو نے جسے نظروں سے گرایا اس کا تو بیڑا ہی غرق ہو گیا۔ آخر میری خطا کیا تھی؟ میں نے تجھے دیکھے بغیر تجھ پر یقین کر لیا۔ میں نے تجھے محسوس کیا، کائنات کے ذرّے ذرّے میں، پتے پتے میں، پیڑ پودوں میں، چشمے سے اُبلتے ہوئے آبشاروں میں، سمندر کی بپھرتی ہوئی لہروں میں، پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں پر، ہواؤں میں فضاؤں میں ہر جگہ تجھے خود سے قریب پایا۔ پھر بھلا میں کیوں کر تیری ذات سے منکر ہو سکتی تھی؟'' (شکوہ)

''یہ جہنم ہی تھا جہاں وہ دوہری زندگی جی رہی تھی۔ دن کے اُجالے میں وہ منافقت کا لبادہ اوڑھے چہرے پر مصنوعی بشاشت لیے لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ لیکن رات کی سیاہی کی طرح اس کا مقدر بھی سیاہ اور تاریک تھا۔ رات اس کے لیے قیامت بن کر آتی۔ جب وہ بستر پر لیٹتی تو انوکھے احساسات اسے بے کل کر دیتے اور وہ جذبوں کے اس گرداب میں ڈوبتی چلی جاتی۔ بستر پر کانٹے سے چبھنے لگتے اور کروٹ بدلتے بدلتے اس کا بدن پھوڑوں کی طرح دکھنے لگتا۔ مشکل سے جو ذرا

آنکھ لگتی تو اسے ایسا لگتا کہ ارد گرد کوئی ہے جو اسے اٹھا رہا ہے۔ ہاتھوں کے لمس سے اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔ لیکن کہیں کوئی نہ ہوتا۔ نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی آواز۔ صرف بڑے میاں کے کھانسنے کی آواز اس کے کانوں کے پردوں پر ہتھوڑے برساتی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کر کے اپنے اس خیالی پیکر کی آغوش میں سمٹ کر دنیا کی ہر رنج غم سے نجات پانے کی کوشش کرتی جسے نہ جانے کب سے وہ اپنے دل اور ذہن میں بسائے تھی۔ لیکن حقیقی دنیا میں اس کے لیے ایسا کوئی وجود نہ تھا۔" (ہونی انہونی)

"اس کے دل میں خواہشات کا بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ صبح سے شام تک ہزاروں خواہشوں کو وہ اپنے دل کی قبر میں دفن کرتی رہتی اور رات کو اس قبر پر بیٹھ کر آنسو بہاتی۔

دل میں موجزن یہ خواہشیں کبھی آنکھوں سے جھلکتیں، کبھی لبوں پر آجاتیں اور پھر اس کے سامنے مسائل کے انبار لگ جاتے۔ وسائل کی کمی کا رونا روتی، خود پر ترس کھاتی، دوسروں پر رشک کرتی اور اپنے شوہر کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ ان لوگوں کی زندگی جس طرح گزر رہی ہے وہ خوش کن تو کیا اطمینان بخش بھی نہیں ہے۔" (انجام کار)

اس طرح کی مثالیں نوشابہ خاتون کے افسانوں میں بھری پڑی ہیں۔

نوشابہ خاتون نے مختلف النوع موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور بیشتر مقامات پر وہ کامیاب رہی ہیں۔ سماجی مسائل پر ان کی نظر گہری ہے۔ مسئلہ جہیز کا ہو یا child labour کا یا پھر بے روزگاری کا۔ موصوفہ نے اکثر و بیشتر ایسے ہی جلتے سلگتے مسائل پر قلم اُٹھایا ہے اور انھیں کامیابی کے ساتھ افسانے کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ایک خاص موضوع جوان کے افسانوں میں نظر آتا ہے وہ ہے ہوس زر اور اس کے برے اثرات۔ "انجام کار"، "خالی ہاتھ" اور "زمین سے آسمان تک کا سفر" اسی قبیل کے

افسانے ہیں۔ایک اور خاص بات جوان کے افسانوں میں نظر آتی ہے وہ ان کا اخلاقی رویہ ہے۔ان کے افسانے کہیں کہیں اصلاحی رنگ اختیار کر جاتے ہیں اور یہ میرے خیال میں اچھا ہی ہے کیونکہ ادب کا مقصد ہی ہے انسان کو انسان بنانا ہے۔

نوشابہ خاتون کا مشاہدہ تیز اور نظر گہری ہے۔دنیا کے مختلف مما لک کی سیر نے ان کے تجربے میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے اور ان تجربات و مشاہدات کو اپنے افسانے میں سمونے کا فن وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔

امید کی جانی چاہیے کہ وہ آئندہ اس سے بھی بہتر افسانے تخلیق کریں گی۔

☆☆☆

شکوہ

''اے خدا تو کہاں ہے؟ جاگتا ہے یا سوتا ہے؟ کیا تو اپنے بندوں کے شر سے عاجز آ گیا ہے؟؟؟ ذرا آنکھیں کھول اور اس ناچیز پر ایک نظر کرم ڈال۔ تو نے مجھے کیوں بھلا دیا؟ کیوں نظر انداز کر دیا؟ یہ نہ سوچا کہ تو نے جسے نظروں سے گرایا اس کا تو بیڑا ہی غرق ہو گیا۔ آخر میری خطا کیا تھی؟ میں نے تجھے دیکھے بغیر تجھ پر یقین کر لیا۔ میں نے تجھے محسوس کیا، کائنات کے ذرّے ذرّے میں، پتے پتے میں، پیڑ پودوں میں، چشمے سے اُبلتے ہوئے آبشاروں میں، سمندر کی بپھرتی ہوئی لہروں میں، پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں پر، ہواؤں میں فضاؤں میں ہر جگہ تجھے خود سے قریب پایا۔ پھر بھلا میں کیوں کر تیری ذات سے منکر ہو سکتی تھی؟

مجھے یہ شکوہ نہیں کہ تو نے مجھے ایک غریب گھرانے میں کیوں پیدا کیا۔ امیری غریبی کوئی معنیٰ نہیں رکھتیں۔ سب سے بڑی دولت تو سچی خوشی ہے۔ اگر ہر انسان دولت مند ہو جائے تو پھر دنیا کا کاروبار کیسے چلے؟ تیرا کوئی کام خالی از مصلحت نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے ایک ظالم اور جابر شخص کے حوالے کرنے میں تیری کون سی مصلحت پوشیدہ تھی؟ مجھے تیری کرم فرمائیوں سے انکار نہیں۔ میری صورت میں تو نے ایک خوبصورت نمونہ پیش

کیا۔ میں تیری قدرت کا شاہکار ہوں۔ تیرا یہ احسان کیا مجھ پر کم ہے کہ تو نے مجھے صحیح سالم بنایا۔ اگر میں لنگڑی لولی ہوتی، اندھی کانی ہوتی تو تجھے کیا فرق پڑتا؟ میں تیرا کیا بگاڑ لیتی؟ تو میرا مقروض تو نہ تھا؟؟؟

تیری انھی نوازشوں نے میرے باپ کی مشکل آسان کر دی۔ ایک شخص مجھ پر مرمٹا۔ میری صورت کا دیوانہ ہوگیا اور بڑی آسانی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ یہ اچھی صورت بھی کیا عجب شے ہے، کبھی رحمت بن جاتی ہے اور کبھی زحمت۔ بظاہر وہ ایک معقول اور خوش اخلاق شخص ہے مگر اندر کا حال سوائے تیرے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ تو پھر، اگر میں پوچھوں کہ تو نے مجھ پر یہ ظلم کیوں کیا تو میں احسان فراموش، ناشکر گزار اور نافرمان گردانی جاؤں گی۔ لیکن تیرے سوا اور کس سے کہوں؟ ایک تو ہی تو ہے جو بغیر کسی سفارش کے اپنے بندوں کی سنتا ہے۔ تجھ تک پہنچنے کے لیے کسی سیڑھی کی ضرورت نہیں۔ تیرے اور تیرے بندوں کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں، کوئی پردہ نہیں۔ تو تو سب کی سنتا ہے۔ اپنے بندوں کے دکھوں کو دور کرنے والا ہے۔ تو سزا بھی دیتا ہے، اور جزا بھی۔ اب صرف اتنا بتا دے کہ میری سزا کی معیاد کیا ہے۔ اس میں کسی ترمیم کی گنجائش ہے یا نہیں؟ میں تیری رحمت کی منتظر ہوں۔ تو تو دلوں کا حال جاننے والا ہے۔ تجھے ضرور یہ علم ہوگا کہ مجھے دولتِ دنیا کی ہوس نہیں۔ میں نے کبھی محلوں کے خواب نہیں دیکھے۔ عیش وعشرت کی کبھی مجھے خواہش نہیں رہی۔ میں تو صرف خلوص ومحبت کی خواہاں ہوں۔ لیکن تیری یہ دنیا فریبی، دھوکے باز، مکار، چالاک، دغاباز اور لالچی لوگوں سے بھری پڑی ہے جو دن رات زمین پر فساد پھیلاتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی نظروں میں رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہر طرف دہشت گردی کی حکمرانی ہے اور تو تماشائی بنا بیٹھا ہے۔ آخر یہ چھوٹ کیوں؟ میں مسلسل ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی ہوں۔ مکروفریب کا شکار ہو رہی ہوں۔ اپنے سسرال والوں کی ہوس کی

بھٹی میں جل رہی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں خالی ہاتھ آئی ہوں۔ اگر خالص ہڈی ہے تو کیا ہوا۔ خالی ہڈی کو تو کتا بھی نہیں پوچھتا۔ میرے میکے والوں کا کہنا ہے کہ شریف لڑکیوں کا ڈولہ جس گھر میں جاتا ہے وہیں سے اس کا جنازہ بھی اٹھتا ہے۔ میرا شوہر رات کے جانے کس حصّے میں نشے میں چور ایک نئے مطالبے کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہے اور مجھے تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیتا ہے۔ میں تھرّا جاتی ہوں۔ مجھے اپنے آس پاس موت کے سائے رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اب میں اس کے ظلم کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاؤں گی۔ اڑوس پڑوس والے تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں۔ حق کا ساتھ دینے کی ان میں ہمت ہی نہیں ہے۔ وہ دنیاوی زندگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھے بیٹھے ہیں۔ اب تو ہی بتا میں کیا کروں؟ تو ہی مجھے کوئی راستہ دکھا۔ تیری مہربانیوں سے میں اب بھی مایوس نہیں کہ مایوسی کفر ہے۔ آخر میں پھر اپنا سوال دہراتی ہوں.......... مجھ غریب پر یہ ظلم کیوں؟"

اچانک دل سے ایک آواز آئی......

"میں یہاں ہوں۔ مجھ سے شکوہ کرنے والے، پہلے تو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ۔ تیرے ہر سوال کا جواب تجھے مل جائے گا۔"

☆☆☆

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، پٹنہ، ۷ار فروری ۲۰۰۹)

سائبان

کہیں دور سے آتی ہوئی شہنائی کی آواز نے آج پھر اس کے اُن خوابیدہ جذبات میں ہلچل مچادی تھی جنھیں ان دس برسوں میں اس نے بڑی مشکلوں سے تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ اس نے پلٹ کر اپنے بغل والے بستر کی جانب دیکھا جو خالی پڑا تھا۔ دل میں درد کی ایک خفیف سی لہر اُٹھی جسے دبا کر اس نے سوچا، کیا فرق پڑتا ہے۔ تو پھر یہ طلب، یہ تڑپ، یہ خلش، یہ اضطراب کیوں؟ کچھ پانے کی آرزو کیوں، کچھ کھونے کا دکھ کیوں؟

اس کے سارے خواب توڑدی کاغذ کے ٹکروں کی طرح بکھر چکے تھے۔

اس نے بھی ہر لڑکی کی طرح بہت سارے سہانے سپنے سجائے تھے۔ اپنے صنم کا ایک حسین خاکہ ذہن میں مرتب کیا تھا جو جاگتے میں اس کے خیالوں میں آتا اور سوتے میں اسے خوابوں سے جگاتا۔ کہتے ہیں جہاں بیری کے پیڑ ہوتے ہیں وہاں ڈھیلے آتے ہی ہیں۔ لیکن اپنی زندگی کی بائیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اب تک اس کے آنگن میں ایک کنکری تک نہ آئی تھی کیونکہ جہیز کے لیے اس کے والد کے پاس بھاری رقم نہ تھی۔ سفید پوشی کا صرف بھرم تھا جو کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھا۔ افلاس کی چکی میں پسا

ہوا انسان اپنی اولاد کو اچھے طور طریقے، اچھی تربیت تو دے سکتا ہے لیکن ان لالچی اور ہوس پرست لوگوں کے خندق جیسے پیٹ کو بھرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔

وقت دبے قدموں گزرتا جا رہا تھا۔ عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ مایوسیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ لیکن بالآخر ایک دن ایک رشتہ آ ہی گیا.... ایک بڑی خامی کے ساتھ۔ چیچک کے ایک شدید حملے نے اس لڑکے کو ایک بڑی نعمت سے محروم کر دیا تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ جب اس نے سنا تو جیسے اس پر بجلی سی گر پڑی جس نے اس کے سارے خواب، سارے ارمان جلا کر خاک کر دیئے۔ لیکن وہ انکار نہ کر سکی کیونکہ وہ اپنے والدین کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کی الجھنیں بڑھانا اسے گوارا نہ تھا۔ اس لیے اس نے اس رشتے کو منظور کر لیا۔ لیکن اس کی ہنستی کھیلتی زندگی مٹی کی مورت بن گئی۔

جب سہیلیاں سہاگ کے گیت گاتیں تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی مرثیہ پڑھا جا رہا ہو۔

وہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی مایوسیوں کے بھنور میں ڈوب اور اُبھر رہی تھی۔ جذبات کی دنیا میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دل کی ڈھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ کاش کوئی ایسا حادثہ ہو جائے کہ نہ میں رہوں نہ میرے خواب اور نہ میرے ارمان۔ رہ رہ کر یہ خواہش اس کے اندر بیدار ہو رہی تھی۔

دولہے کو اس کے دوستوں نے حجلۂ عروسی کے دروازے تک پہنچا دیا۔ اندر وہ ایک چھڑی کے سہارے داخل ہوا۔ بار بار وہ چھڑی کو لہرا کر کمرے کی پوزیشن کا اندازہ لگا رہا تھا۔ کسی طرح وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں دلہن بیٹھی تھی۔ دلہن نے نظریں اُٹھا کر دیکھا اور غش کھاتے کھاتے بچی۔ آنکھوں کی خامی کو تو اس نے سیاہ چشمے سے چھپا لیا تھا لیکن چیچک کے بے شمار داغوں نے اس کے چہرے کے خد و خال کو بالکل مسخ کر دیا تھا۔ جلد

کھردری اور شکن آلود ہوگئی تھی۔ چہرہ شادابی اور کشش سے محروم تھا۔

کیا یہی ہے اس کے سپنوں کا شہزادہ.....؟ دل میں نفرت کی ایک شدید لہر اُٹھی اور آنسوؤں کی لڑیاں اس کے دامن میں جذب ہوتی چلی گئیں۔ کچھ دیر اُن دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے ٹٹول کر اپنی منکوحہ کی موجودگی کو محسوس کیا۔

''یقیناً تم بہت خوبصورت ہوگی لیکن میرا یہ المیہ ہے کہ میں تم کو دیکھ نہیں سکتا۔ آج میں بے حد خوش ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم اپنی ساری محرومیوں کو بھول جاؤ گی۔''

''ہونہہ! یہ مجھے کیا خوشیاں دے گا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھ کر لوگ مجھ پر ترس کھائیں گے۔ میری قسمت پر افسوس کریں گے۔ ہر محفل، ہر تقریب میں میں احساس کمتری میں مبتلا رہوں گی۔ اس سے بہتر ہے کہ میں ساری دلچسپیوں سے منہہ موڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلوں۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ بولتی کیوں نہیں؟ کیا اس شادی سے تم خوش نہیں ہو؟''

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ قہقہے لگا کر کہے کہ بھلا اندھیرے کنویں میں گر کر بھی کوئی خوش رہ سکتا ہے؟

''یقین مانو' میں پھول کی طرح تمھیں اپنے بیڈروم میں سجا کر رکھوں گا۔''

''جیسے میں کوئی شو پیس یا گلدستہ ہوں۔'' اس نے ناگواری کے ساتھ سوچا۔ اب نہ کوئی اُمنگ تھی، نہ جوش، نہ ولولہ۔ ایک لاش کی طرح اس نے خود کو شوہر کے سپرد کردیا۔

دوسرے دن اس نے اپنا سارا سنگار اُتار دیا۔ کس کے لیے سجوں؟ کون ہے دیکھنے والا؟

''تم نے چوڑیاں کیوں اُتار دیں؟'' شوہر نے سونی کلائی کا اندازہ لگا کر پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔ مگر بار بار ایک ہی سوال سن کر جھنجھلا اُٹھی۔

''کیوں پہنوں چوڑیاں؟ ہے کوئی آنکھوں والا جو انھیں دیکھے؟'' اور چوڑی کی کرچیوں نے اس شخص کے احساس کو لہولہان کر دیا۔

جب وہ اسے تفریح کے لیے کہیں لے جانا چاہتا تو وہ انکار کر دیتی۔ اسے خود کو تماشا بنانا گوارا نہ تھا۔ جب بھی وہ اسے آواز دیتا تو سنی ان سنی کر دیتی۔ شوہر کی پکار پر اسے بے طرح غصہ آ جاتا۔ کبھی وہ لڑکھڑا کر گر جاتا تو اس کا دل قہقہے لگانے لگتا۔ نہ جانے اس کے دل کو ایسا کرنے سے کون سا سکون حاصل ہوتا تھا۔

خدا جب کسی سے بصارت، سماعت یا قوتِ گویائی چھین لیتا ہے تو اسے آگہی کی غیر معمولی طاقت عطا کر دیتا ہے۔ وہ اسی طاقت کے سہارے بیوی کے چہرے پر چھائی ناگواری، بے زاری اور الجھنیں دیکھتا رہتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنی شریک زندگی سے بہت ساری باتیں کرے اور وہ سب پوچھے جو اس کے دل میں سوال بن کر بار بار اکسا رہا تھا۔

''کیوں آئی تم میری زندگی میں؟ کیوں میرے خوابیدہ ارمانوں کو جگا دیا؟ کیوں ازدواجی لذتوں سے آشنا کر کے پل پل مجھے موت کی طرف گھسیٹ رہی ہو؟ کیوں میرا چین سکون چھین لیا؟ کیوں' آخر کیوں؟''

لیکن اس نے اپنے ہونٹوں پر قفل ڈال لیا تھا کہ وہ اپنی طبیعت کو مزید مکدر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کھویا کھویا اور خاموش سا رہنے لگا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر کبھی کبھی وہ اپنے رویئے پر شرمساری ہو جاتی۔ اسے لگتا جیسے اس کے اندر سے بار بار یہ آواز آ رہی ہے۔

''آخر تم اس کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیوں کرتی ہو؟ وہ تمھارا مجازی خدا

ہے۔ تمھارا سائبان، تمھارا محافظ۔'' لیکن فوراً ہی ایک دوسری آواز اسکے کانوں سے ٹکراتی۔

''ہونہہ! سائبان، محافظ؟ جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتا وہ بھلا دوسروں کا محافظ کیسے بن سکتا ہے؟'' پھر پہلی آواز آتی۔

''مت سوچو ایسا۔ ظاہری حسن پر مت جاؤ۔ دیکھو تو سہی اس کا دل کتنا خوبصورت ہے۔ چھوڑ دو نفرت.....''

''کیسے چھوڑ دوں؟ وہ شہزادہ جو ہر وقت میری نظروں کے آگے رہتا تھا وہ آج بھی میرے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہے۔''

ہمہ وقت اس دل کے اندر یہ تکرار ہوتی رہتی۔

اب وہ دیر تک گھر سے باہر رہتا۔ کبھی کبھی گھنٹوں اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کو گھورتا رہتا۔ وہ چھت جو اس کے والدین نے اپنے اپاہج بیٹے پر ترس کھا کر اس کے نام کر دی تھی۔ اسے سر چھپانے کا آسرا دے دیا تھا۔ وہ اندھوں کے اسکول میں پڑھاتا تھا جس سے دو وقت کی روٹی تو مہیا ہو جاتی تھی لیکن وہ پیار جو انسان کی زندگی اور صحت کے لیے ٹانک کا کام کرتا ہے، اسے وہ کس دکان سے خریدے؟ وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا۔

ایک دن اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے باہر جا رہا ہے۔

پھر ایک ہفتہ بعد اس کا مختصر سا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

''یقیناً یہ خبر تمھارے لیے خوشی اور طمانیت کا باعث ہوگی کہ تمھیں زندگی کے اس عذاب اور ہیجانی کیفیت سے چھٹکارا دلانے کے لیے میں تمھاری زندگی سے بہت دور آ گیا ہوں.....کبھی نہ واپس جانے کے لیے۔''

تھی۔ جس کی چہار دیواریاں اور ڈیوڑھیاں کس قدر شاندار تھیں۔ اور اب تو یہ تقریباً کھنڈر بن چکی تھیں۔ ستون مٹیالے ہو چکے تھے اور محراب کی جالیاں کہیں کہیں سے ٹوٹ کر اپنا حسن کھو چکی تھیں۔ وہ چند منٹ کھڑا انتظار کرتا رہا کہ کسی طرف سے کوئی ملازم آئے گا اور اس کا سامان اٹھا کر لے جائے گا۔ لیکن کہیں کوئی ملازم نظر نہ آ رہا تھا۔ البتہ ہر عمر اور ہر قد و قامت کے چھوٹے بڑے بچے کھیل رہے تھے جو اپنے آپ سے بھی لاتعلق تھے۔ چاک گریباں اور ٹوٹی چپل میں ہی مست تھے۔

سامنے برآمدہ اور دالان میں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ انھی میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر خود بخود یہ شعر آ گیا:

ہم اپنے گھر میں آئے ہیں مگر انداز تو دیکھو
ہم اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آئے ہیں

پھر ماضی کے چند مناظر ذہن کے پردے پر ابھر آئے۔ وہی حویلی ہے، وہی دالان ہے۔ تخت پر فرش لگا ہے۔ چند مصاحب بیٹھے ہیں۔ ملازم حکم کی تعمیل کے لیے کھڑے ہیں۔ ابا حقہ کی نے منہ میں دبائے خوش گپیوں میں مشغول ہیں۔

منظر بدل گیا۔

حویلی کے احاطہ میں ایک ہجوم ہے۔ کوئی مجرم پکڑ کر لایا گیا ہے۔ اسکی سزا ابا کو تجویز کرنی ہے۔ بڑے غور و فکر کے بعد جو سزا سنائی گئی وہ بڑی ہی عجیب و غریب ہے۔ یہ نظارہ بڑا دلخراش اور عبرتناک ہے۔ اسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ یہ سزا صرف غریبوں، بے بسوں اور لاچاروں کے لیے ہی کیوں؟ جب سنگسار کرنے کی وحی نازل ہوئی تھی تو ایسی کوئی تخصیص عاید تو نہیں ہوئی تھی۔

منظر پھر بدل گیا۔

ابا شکار کر کے لوٹے ہیں۔ آج انھوں نے ہرن کا شکار کیا ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر

بے حد خوش ہیں۔ داد دینے والوں کا جمگھٹا ہے۔ اندر باہر ہل چل مچی ہوئی ہے۔ ہرن کی کھال دیوان خانہ کی دیوار پر بطور یادگار سجادی گئی ہے تا کہ آنے والی نسلیں ان کے کارنامے پر فخر کرسکیں۔

ابھی وہ اس طلسم میں کھویا ہوا ہی تھا کہ کوئی شخص اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور بھیّا کہہ کر لپٹ گیا۔ یہ چھوٹے بھیّا تھے۔ وہ اسے حویلی کے اندر لے گئے۔ بڑے بھیّا بستر علالت پر پڑے تھے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ اس نے حسرت سے چاروں طرف دیکھا۔ حویلی کا ہر حصہ زبان حال سے اپنی کسمپرسی کی داستان بیان کر رہا تھا۔ نہ جانے کس جذبے کے زیر اثر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ یہ آنکھیں بھی عجیب ہیں۔ پل بھر میں سب کچھ عیاں کردیتی ہیں۔ رات گزارنے کے لیے جو کمرہ اسے ملا تھا وہ امّاں کا کمرہ تھا۔ بالکل ویسا ہی۔ وہی پلنگ، وہی دروازے، وہی کھڑکیاں۔ البتہ یہ سب اپنے مکینوں کی طرح رنگ وروغن کھو چکے تھے۔ جگہ جگہ مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔ چمگادڑوں نے روشن دان کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ اسی کمرے میں اس نے بارہا امّاں کی کراہیں اور سسکیاں سنی تھیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

''کیوں رو رہی ہیں امّاں، سر دُکھ رہا ہے؟'' انھوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر ڈر لگ رہا ہے؟'' اس کے معصوم ذہن میں یہی بات آئی۔ امّاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے قریب کرتے ہوئے سینے سے لگالیا۔ امّاں کے جسم کی حرارت اور ہاتھوں کا لمس اب بھی تازہ تھا۔ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور سر جھٹک کر ماضی میں گم ہوگیا۔

ابّا تو شاذ ونادر ہی اندر آتے تھے۔ ان کے لیے باہر کی دنیا زیادہ پُرکشش تھی۔ ساری ساری رات محفلیں جمی رہتیں۔ دوست احباب سایہ کی طرح ساتھ لگے رہتے۔ اور امّاں بیچاری..... عورت ذات تو ازل سے خود کو مظلوم اور مجبور سمجھتی آئی ہے۔ اپنے حق کے لیے اس نے احتجاج کرنا سیکھا ہی نہیں ہے۔ اپنے ارمان، اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ

کر سسکیوں اور سمجھوتوں میں بسر کر لیتی ہے۔ امّاں بھی انھی میں سے ایک تھیں۔ نہ جانے کس مٹی کی بنی تھیں۔ حرف شکایت زبان پر کبھی نہ لاتیں۔

جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو قصبہ کے اسکول میں اس کا داخلہ کروا دیا گیا۔ دونوں بڑے بھائیوں کو پڑھنے لکھنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سارا دن آوارہ گردی میں گزارتے۔ آئے دن نازیبا حرکتیں کرتے رہتے۔ امّاں ان کی بدتمیزیاں اور ناروا سلوک درگزر کر دیا کرتیں کہ آخر یہ بھی تو انھی کے بچے ہیں۔ کیا ہوا اگر وہ ان کے سگے نہیں ہیں۔

ایک دن ابّا شکار پر گئے تو زندہ واپس نہ آئے.....ان کی لاش ہی آئی۔ ان کے گزرنے کے بعد دونوں بھائی اور بھی خودسر ہو گئے۔ من مانی کرنے لگے۔ اس کا کوئی کام انھیں گوارا نہ تھا۔ ہر کام میں رخنہ ڈالتے، لیکن امّاں ڈھال بن کر ہر وار سے بچا لیتیں۔ ان کی مخالفت کے باوجود اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ ابھی زیر تعلیم ہی تھا کہ امّاں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ان کی بے وقت کی جدائی نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹا اور امّاں کا خواب پورا کرنے میں لگ گیا۔

جب سر پر سایہ دار درخت نہ ہو، دھوپ کڑی اور گرم ہوا کے تھپیڑے ہوں تو انسان کیا کرے، کہاں جائے۔ اس نے ابھی کوئی فیصلہ نہ کیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے۔ کہاں رہنا ہے کہ اچانک ایک دن منشی جی اس کے پاس آئے اور کہنے لگے۔

''حضور آپ کے ساتھ تو بڑی حق تلفی کی گئی ہے۔ آپ کے بھائیوں نے ساری عمدہ زمینیں اپنے نام کر لی ہیں۔ بنجر اور بیکار آپ کے لیے چھوڑ دی ہے۔ حویلی پر بھی دونوں نے اپنا نام چڑھا لیا ہے''۔

''تو میں کیا کر سکتا ہوں''۔ وہ بیزاری سے بولا۔ اب یہ اس کی فطرت کا قصور تھا یا تعلیم کا کہ اسے لڑنا جھگڑنا بالکل پسند نہ تھا۔ اس نے بھائیوں سے کوئی سوال و جواب نہ کیا۔ بہت ہی خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔

اس واقعہ کو بیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ان بیس سالوں میں اس نے بے شمار دولت حاصل کی مگر گھر والوں کو اس کی خبر نہ تھی۔ وہ تو اسے مرا ہوا سمجھ کر آرام سے بیٹھے تھے۔ اور اب اس کے اچانک آجانے سے حویلی میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ جتنی زبانیں تھیں اتنی ہی بولیاں۔ البتہ وہ اتنا ضرور سمجھ گئے تھے کہ اب وہ خاصہ مالدار ہو چکا ہے اور شاید اپنا حصہ وصولنے آیا ہے تاکہ اس کے مال و دولت میں اور اضافہ ہو جائے۔ وہ آپس میں باتیں کرتے۔

''اتنے دنوں بعد یہ ضرور اپنا حق وصول کرنے آیا ہے۔''

''بچا ہی کیا ہے، ساری زمینیں تو گروی پڑی ہیں۔ اگر یہ اپنا حصہ لے لے گا تو ہم کھائیں گے کیا؟''

''میری مانو تو بہلا پھسلا کر جلد اسے چلتا کر دو۔''

سب اپنی اپنی رائے پیش کر رہے تھے اور وہ ان باتوں سے بے خبر ماضی کی بھول بھلیّوں میں گم تھا۔

دوسری صبح سب اکٹھے بیٹھے تھے۔ چھوٹے بھیّا نے بات شروع کی۔

''آج تمھیں یہاں دیکھ کر بتا نہیں سکتا کہ ہمیں کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میری رائے ہے کہ تم یہیں رہ جاؤ۔ حالاں کہ اب یہاں رہنا تمھارے لیے بہت مشکل ہوگا کیوں کہ جس عیش و آرام کے تم عادی ہو چکے ہو وہ یہاں مہیا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی جہاں تک ہو سکے گا ہم تمھارے آرام کا خیال رکھیں گے اور تمھارا حق بھی تمھیں مل جائے گا۔''

وہ دھیرے سے مسکرایا اور جیب سے ایک بڑی رقم کا چیک نکال کر بڑھاتے ہوئے بولا۔

''آج میں کچھ لینے نہیں دینے آیا ہوں۔''

☆☆☆

(ایوان اردو، اکتوبر ۲۰۰۵)

پکھیرو

وہ ایک ایک دیوار، ایک ایک دریچہ اور محراب کو بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جنھیں اس نے اپنے خون پسینہ سے سینچا تھا۔ گھر کی ایک ایک اینٹ میں اس کے پسینے کی خوشبو بسی تھی ۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ صبح اٹھتا، در و دیوار کو حسرت سے دیکھتا، ایک ایک چیز کو جھاڑتا، پونچھتا، سجاتا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ایک خاص قسم کی لذت اور طمانیت کا احساس ہوتا۔ محراب کو جھاڑتے ہوئے اس نے دیکھا کہ محراب کے نیچے والی طاق میں اس بار پھر چڑیوں نے گھونسلہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ وہ صبح سے شام تک تنکے چن چن کر لاتیں اور اپنا آشیانہ بناتیں۔ جب گھونسلہ تیار ہو گیا تو ایک چڑیا نے دو انڈے دیے۔ ان انڈوں سے دو بچے نکلے۔ بچے کیا تھے بس گوشت کے لوتھڑے تھے جن کی دیکھ بھال میں دونوں نر مادہ لگے تھے۔

یہ فطرت کا تقاضا ہے، ممتا کا بے لوث جذبہ ہے، جسے قدرت نے ہر ذی روح کو عطا کیا ہے۔ گویا زندگی خدا کے بعد ماں باپ کا دیا ہوا انمول عطیہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کی آبادی میں آج اتنا اضافہ نہ ہوا ہوتا۔

دونوں نر مادہ باری باری چرنے چگنے کے لیے جاتے۔ ایک جاتا تو دوسرا بچوں کی

حفاظت کرتا۔ دشمنوں کے حملوں سے بچانے کے لیے اسے اپنے پروں میں سمیٹ لیتا۔ سیو سیو کر اسے بڑا کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پر نکلنے لگے اور جب پوری طرح پر نکل آئے وہ اُڑنے کے لائق ہو گئے تو ایک دن پھُر سے اڑ گئے۔ اپنا گھونسلہ کہیں اور آباد کر لیا۔

وہ بڑے ہی انہماک سے چڑیوں کی ان حرکات وسکنات کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے کہیں کھو گیا، ماضی میں گم ہو گیا۔

چار دنوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ ہوا بھی طوفانی تھی۔ پورا علاقہ جل تھل بنا ہوا تھا۔ بادو باراں کے زور دار تھپیڑوں نے اس کی جھونپڑی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کہیں سے ٹین کھسک گیا تھا تو کہیں سے پھونس اُڑ گیا تھا اور کہیں پلاسٹک اُڑ کر دور جا گری تھی۔ بارش کی بوچھار جھونپڑی کے اندر تیزی سے آنے لگی تھی۔ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ بس ایک پلنگ بھر جگہ بچی ہوئی تھی۔ جس پر بیک وقت تین افراد نہیں سو سکتے تھے۔ جب بیوی بچے کو لے کر سوتی تو وہ بیٹھا رہتا۔ جب وہ لیٹتا تو بیوی بیٹھی رہتی۔ کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو رہی تھیں۔ انھیں بچے کی بڑی فکر تھی۔

''منا کے بابا!'' اس نے اونگھتے ہوئے شوہر کو مخاطب کیا۔

''اب کی برسات ختم ہوتے ہی ایک کوٹھری کا بندوبست کیجیو۔ اس جھونپڑی میں تو ہم مر جائیں گے۔ اپنا نہیں تو بچے کا خیال کرو۔''

''تو کیا سمجھتی ہو کہ مجھے بچے کا دھیان نہیں ہے۔ مجھے خود اس کی فکر ہے۔ پر کیا کروں، جیب ساتھ نہیں دیتی۔''

''اب دیکھو نا کھانے پینے کا سامان ختم ہو رہا ہے۔ پانی کا زور کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ آس پاس کوئی دکان بھی نہیں ہے۔ ایسے میں بچہ تو بھوکا ہی مر جائے گا۔''

خدا خدا کر کے بارش کا زور تھم گیا۔ زندگی معمول پر آ گئی۔ وہ بھی کام پر جانے

لگا۔ وہ ایک کارخانے میں منشی تھا۔ بہت ہی کم تنخواہ تھی۔ بڑی مشکل سے تین افراد کی گزر بسر ہورہی تھی اوراب ایک کوٹھری کی فکر بھی ہورہی تھی۔ کوٹھری کا مالک چھ ماہ کا ایڈوانس مانگ رہا تھا۔ اس نے بھی اپنے مالک کو ایڈوانس کے لیے عرضی دے دی تھی لیکن ایک منشی کو ہزار روپے ایڈوانس ملنا مشکل تھا۔

بہت ہی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ٹھیلا کرایے پر لیا جس پر کچھ سبزیاں اور پھل رکھ کر گنجان آبادی والے نکڑ پر بیچتا۔ صبح پانچ بجے اپنا ٹھیلا لگاتا اور نو بجے کارخانہ جاتا۔ وہاں سے واپس آ کر پھر رات کے گیارہ بجے تک سبزیاں اور پھل فروخت کرتا۔ جوڑ جوڑ کر اس نے اتنا پیسہ جمع کر لیا کہ برسات آنے سے قبل ایک کوٹھری کرایے پر لے لی۔

کوٹھری میں آنے کے بعد اس کی رہائش قدرے بہتر ہوگئی۔ فراغت ہونے پر ایک بچے نے اور جنم لیا۔

وہ بچوں کو بڑے جتن سے پال رہا تھا۔ کھان پان سے لے کر پڑھائی لکھائی میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ بچوں کی نت نئی فرمائشیں پوری کرتا۔ بڑے بیٹے نے کہا۔

''بابا اس جاڑے میں مجھے نیا کوٹ چاہیے۔ اب پرانا سوئٹر نہیں پہنوں گا۔ میرے دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے! بن جائے گا تو کیوں فکر کرتا ہے۔'' لیکن وہ خود فکر میں ڈوب گیا۔ کہیں نہ کہیں سے کوٹ کے لیے پیسہ کا انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچے کو ٹھنڈ لگ جائے۔ دیکھتا ہوں شاید مالک تھوڑا ایڈوانس دینے کے لیے راضی ہو جائے۔ ابھی وہ فکر میں ڈوبا ہی تھا کہ چھوٹے بیٹے نے کہا۔

''بابا میرے سارے کپڑے پرانے ہو گئے ہیں۔ مجھے نئی شرٹ چاہیے۔''

"وہ بھی بن جائے گی۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔"

وہ بچوں سے زیادہ خود کو باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔

"بابا مجھے یہ چاہئے، بابا مجھے وہ چاہئے۔"

اس طرح فرمائشوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس نے کبھی بیٹوں کی فرمائشوں کو رد نہیں کیا تھا کہ وہی تو اس کے مستقبل تھے۔ حالات کچھ بہتر ہوئے تو حوصلہ بھی بلند ہوا۔ اس نے اور زیادہ محنت کرنی شروع کر دی اور اتنا کچھ حاصل کر لیا کہ زمین کا ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید لیا۔ پھر دھیرے دھیرے مکان کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ بڑی لگن اور بہت ہی محنت مشقت سے اس نے اپنا مکان مکمل کیا۔ لیکن مکان اسے راس نہ آیا۔ بیوی داغ مفارقت دے گئی۔ گاڑی کا ایک پہیہ ٹوٹ چکا تھا۔ اب اسے ایک ہی پہیہ سے زندگی کی گاڑی کھینچنی تھی۔ لڑکے دونوں بڑے ہو چکے تھے۔ لیکن ان کا انداز جداگانہ تھا۔ انھوں نے باپ کو محنت مشقت کرتے دیکھا تھا لیکن خود اس کا مزہ نہیں چکھا تھا۔ وہ بڑے ہی ناز و نعم میں پلے تھے۔ ان کی ہر خواہش، ہر خوشی پر باپ نے خود کو قربان کر دیا تھا اور اب بیوی کی جدائی اور جان توڑ محنت نے اسے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ لیکن اپنے بچوں کو دیکھ کر وہ تازہ دم ہو جاتا۔ ساری تھکاوٹیں، سارے دکھ بھول جاتا اور ایک روز تو اس کے پورے جسم میں ایک عجیب سی توانائی بھر گئی تھی۔ وہ برسر روزگار ہو گئے تھے۔ اب اسے کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ایک بات کا دکھ تھا کہ وہ دونوں اس سے جدا ہو کر دور چلے گئے تھے۔

پھر بھی وہ سوچ رہا تھا کہ چند دنوں کی تو بات ہے۔ بہت جلد بہوئیں آئیں گی، پوتے پوتیاں ہوں گی تو یہ گھر آباد ہو جائے گا۔ بہوئیں بھی آئیں۔ پوتے پوتیاں بھی ہوئیں۔ لیکن گھر آباد نہ ہو سکا۔ بیٹے اور دور ہوتے ہو گئے۔

ایک دن اس نے دونوں بیٹوں سے کہا۔

''بیٹا! اب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بیمار بھی رہنے لگا ہوں۔ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ اس گھر کو کرایے پر اٹھا دوں اور تمھارے ساتھ ہی رہوں۔''

باپ کی بات سنتے ہی دونوں بیٹے ایک دوسرے کا منہہ دیکھنے لگے۔ بڑا بیٹا تو خاموش ہی رہا۔ چھوٹے نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابھی میں پوری طرح سیٹل نہیں ہوا ہوں۔ جب سیٹل ہو جاؤں گا تو آپ کو اپنے پاس بلا لوں گا۔''

پھر جب بھی وہ دونوں فون کرتے یا گھر آتے تو وہ بڑی آس بھری نظروں سے انھیں دیکھتا کہ شاید اس بار وہ انھیں اپنے ساتھ لے جانے کی بات کریں۔ لیکن ہر بار وہ ہفتہ دو ہفتہ سیر و تفریح کر کے چلے جاتے اور وہ حسرت بھری نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہ جاتا۔ لیکن آج چڑیوں کی کہانی نے اس پر یہ حقیقت عیاں کر دی کہ قانون قدرت یہی ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ لیکن پھر بھی وہ سوچ رہا تھا کہ حیوان اور انسان میں کچھ فرق ہونا چاہئے کیونکہ انسان کو تو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔

☆☆☆

(آجکل دسمبر ۲۰۰۵)

حاصل زندگی

برسوں بعد آئینہ کے سامنے کھڑی وہ اس سراپے کو بغور دیکھ رہی تھی جس کے بالوں میں اب ان گنت چاندی کے تار جھلملا رہے تھے۔ وہ اِس چہرے میں اُس چہرے کو تلاش کر رہی تھی جو کبھی موسم سرما کی چمکیلی اور سنہری دھوپ کے مانند روشن تھا۔ نہ جانے کہاں کھو گیا تھا وہ روشن چہرہ؟ وہ اس کی کھوج میں پیچھے بہت دور لوٹ گئی۔ تبھی امّی کی کراہتی ہوئی آواز کی بازگشت کانوں میں گونجی۔ وہ تیزی سے ان کے پاس پہنچی۔

''کیا ہوا امّی! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟''

''ہاں بیٹا! تمھارے ابّو ابھی تک نہیں آئے؟'' اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ابّو آ گئے تھے۔ اس نے دروازہ کھول کر فائل اُن کے ہاتھوں سے لے لی۔

''ابّو! آپ کے لیے چائے بناؤں؟''

''ہاں بیٹا! ذرا فریش ہو لوں۔ پھر ٹیوشن کے لیے بھی جانا ہے۔''

باپ کے تھکے تھکے لہجے نے اس کے دل کو دکھ درد سے بھر دیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ان کے چہرے سے ساری تھکن دور کر دیتی۔ وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کے تئیں بہت حساس تھی۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتی کہ کس طرح ان کی محرومیوں کو دور کر دے۔

ابّو کو چائے دینے کے بعد وہ باورچی خانہ کا باقی کام بھی نبٹانے لگی۔ جس تیزی سے اس کے ہاتھ چل رہے تھے اتنی ہی تیزی سے اس کا ذہن بھی کام کر رہا تھا۔

''ابّو بے چارے کو ہم لوگوں کے لیے کتنی محنت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ ایک معمولی ماسٹر کی تنخواہ ہی کتنی؟ اتنی قلیل آمدنی ہم پانچ بھائی بہنوں کی پرورش کے لیے ناکافی ہے۔ اسی لیے ابّو کو اضافی کام بھی کرنا پڑتا ہے۔''

اس نے مصمم ارادہ کیا کہ پڑھ لکھ کر وہ گھر کی معاشی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ابّو کی مدد کرے گی.....اور ان کی دست راست بن کر ان کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرے گی۔

وہ اپنی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے ماں کی صحت یابی کی دعائیں کرتی۔ لیکن وہ تو دائمی مریض تھیں۔ ایک رات چپ چاپ دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ ان کے رخصت ہوتے ہی گھر پر سوگواری سی طاری ہوگئی۔ سب بھائی بہن مغموم اور اداس ہوگئے۔ اور ابّو تو ایسے ٹوٹے جیسے ان کے ریڑھ کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہو لیکن انھوں نے اپنے بچوں کو بکھرنے نہ دیا۔ سبھوں کو اپنے آزوباز و اس طرح بٹھائے رکھا جیسے مرغی اپنے بچوں کو اپنے پنکھ میں سمیٹ لیتی ہے۔ آمنہ خالہ نے اس غم کی گھڑی میں بہت ساتھ دیا۔ وہ دور کی رشتہ دار تھیں اور پڑوس ہی میں رہتی تھیں۔ پھر سب کچھ معمول پر آگیا۔ کسی کے چلے جانے سے دنیا کا کاروبار بند نہیں ہوجاتا۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ بچے وقت پر اسکول جانے لگے۔ اس نے بھی کالج جانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کالج جاتے وقت وہ اکثر چابھی آمنہ خالہ کے یہاں رکھ دیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ چابھی رکھنے کے لیے ان کے یہاں گئی تو اتفاق سے عمر سے ملاقات ہوگئی۔

''آؤ فائزہ! آج بہت دنوں پر دکھائی دی ہو۔ خیریت تو ہے؟'' عمر نے اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔

''ہاں! اللہ کا شکر ہے۔ خالہ کہاں ہیں؟ ان کے پاس چابھی رکھنے آئی ہوں۔''

اس نے متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔

''وہ تو نہیں ہیں۔ لیکن تم کہاں جا رہی ہو؟''

''کالج جا رہی ہوں۔ میں نے اپنی پڑھائی پھر سے شروع کر دی ہے۔''

''اوہ! ویری نائس۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا۔''

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔ خالہ آجائیں تو یہ چابھی انھیں دے دینا۔''

خالہ کی غیر موجودگی میں وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا اس نے مناسب نہ سمجھا سو خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔

''السلام علیکم خالو جان!'' کمرے میں داخل ہوتے ہی عمر نے سلام کیا۔

''جیتے رہو۔ کہو کیسے آنا ہوا؟''

''آپ لوگوں سے ملے بہت دن ہو گئے تھے۔ سوچا چل کر ملاقات بھی کر لوں اور یہ خوش خبری بھی سنا دوں کہ مجھے جاب مل گئی ہے۔''

''ارے واہ! یہ تو تم نے بہت اچھی خبر سنائی۔'' انھوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ میری دعا ہے کہ خدا تمھیں زندگی کی ہر منزل پر اسی طرح کامیابی عطا کرتا رہے (آمین۔)

''بس یہ آپ لوگوں کی دعاؤں کا ہی تو اثر ہے خالو جان۔'' اس نے انکساری سے کہا۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بڑی خاموشی ہے۔ سب لوگ کہاں ہیں۔''

''بچے کہیں کھیل رہے ہوں گے اور فائزہ شاید باورچی خانہ میں ہو۔''

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد عمر نے باورچی خانے کا رخ کیا۔

''کیا ہورہا ہے فائزہ بی بی؟''

''تمھارے لیے چائے بنارہی ہوں۔'' فائزہ نے پلٹ کر دیکھا۔

''میری آمد کی خبر تمھیں کیسے ہوئی۔''

''مجھے الہام ہوا ہے۔''

''اوہ! تمھاری شخصیت تو بہت اہم ہوگئی ہے۔ اب تمھیں الہام بھی ہونے لگا۔ تب تو اور باتوں کا بھی تمھیں الہام ہوا ہوگا۔''

''مثلاً!''

''مثلاً یہ کہ اب میں بے کار سے باکار ہوگیا ہوں۔ مجھے جاب مل گئی ہے۔''

''واہ! تب تو تمھیں مٹھائی کے ساتھ آنا چاہئے تھا۔''

''یہ بھی خوب رہی۔ نہ کسی خوشی کا اظہار نہ مبارک باد..... بس مٹھائی کا تقاضہ۔ لاؤ پہلے چائے پلاؤ۔''

''لیجیے چائے حاضر ہے۔'' فائزہ نے اس کے ہاتھ میں پیالی تھمادی۔

''واہ! مزہ آگیا۔ کیالاجواب چائے ہے۔'' اس نے چائے کی چسکی لی۔

''بنا بھی تو لاجواب ہاتھوں سے۔'' فائزہ نے اِترا کر کہا۔

''ہاں سو تو ہے۔ اب ان لاجواب ہاتھوں کا بنا ہوا کھانا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔''

ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔

''اچھا اب زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے میری مٹھائی تو لاؤ۔''

''اچھا بابا! آجائے گی تمھاری مٹھائی۔ اب میں چلتا ہوں۔''

چند دنوں بعد آمنہ خالہ مٹھائی کے ساتھ پہنچ گئیں۔ ڈبہ فائزہ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے انھوں نے ابّو کے متعلق پوچھا۔

''وہ تو نہیں ہیں۔ آپ بیٹھئے نا۔'' لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ہی وہ اُٹھ گئیں۔

''اب میں چلتی ہوں۔ پھر آؤں گی۔''

''کیوں خالہ! ابھی تو آپ آئی ہیں۔ نہ کوئی ٹھنڈا نہ گرم۔ کچھ دیر تو اور بیٹھئے۔ ابّو بھی اب آہی جائیں گے۔''

فائزہ نے دوبارہ انھیں بٹھاتے ہوئے فرض میزبانی نبھایا۔

اور واقعی کچھ ہی دیر بعد ابّو آگئے۔ وہ آمنہ خالہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''کہیئے بہن کیسی ہیں؟ بیٹے کی کامیابی پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کریں۔ میں خود آپ کے یہاں جانے والا تھا لیکن معذرت خواہ ہوں فرصت کی کمی کی وجہ سے نہ جا سکا۔''

ابّو واقعی بہت شرمندہ تھے۔

''کوئی بات نہیں بھائی صاحب! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ بس آپ کی دعائیں ہی کافی ہیں۔''

''اب آپ عمر کی شادی کر دیں۔ آپ کی تنہائی دور ہو جائے گی۔'' ابّو نے مشورہ دیا۔

''میں خود بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ بلکہ میں نے تو لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔''

''کون ہے وہ خوش نصیب جسے آپ نے اپنے لائق فائق بیٹے کے لیے منتخب کیا ہے؟''

''وقت آنے پر وہ بھی معلوم ہو جائے گا۔''

اتنا کہہ کر وہ چلی گئیں۔ کچھ دن یوں ہی گزر گئے لیکن ایک دن اچانک پھر آمنہ خالہ پہنچ گئیں۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا۔

''بھائی صاحب! آج میں آپ کے پاس ایک خاص مقصد کے تحت آئی

ہوں۔ دیکھیے مجھے مایوس نہ کیجیے گا۔''

''کہنا وہ مقصد کیا ہے؟'' ابّو نے سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھا۔

''میں آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔''

ابّو حیرت اور خوشی کی تصویر بنے انھیں دیکھ رہے تھے۔ خوشی خود چل کر ان کے گھر آئی تھی۔

''آپ نے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا بھائی صاحب؟''

''ہاں! نہیں!!'' ابّو ایک دم گڑبڑا گئے۔ پھر خود کو سنبھال کر کہا۔

''آپ میرے لیے اتنا نایاب تحفہ لے کر آئی ہیں اور میں انکار کردوں۔ یہ تو کفرانِ نعمت ہوگی۔''

پھر دونوں فریقین کے باہمی مشورہ اور خوشی سے بہت ہی سادگی کے ساتھ عمر اور فائزہ کی منسوب طے ہوگئی۔

آمنہ خالہ کو بہولانے اور اپنا گھر بسانے کی جلدی تھی لہٰذا شادی کے لیے اصرار کرنے لگیں لیکن ابّو کو فائزہ کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار تھا۔ اور خود فائزہ کی بھی یہی خواہش تھی۔ لیکن انسان کچھ سوچتا ہے اور اللہ کچھ اور ہی۔ اس دن جب وہ بی اے فائنل کا آخری پیپر دے کر لوٹی تو گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ خلافِ معمول گھر میں کچھ ہل چل سی مچی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے ابّو کے کمرے کی طرف آئی۔ وہاں اس نے جو نظارہ دیکھا اس نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ ابّو بے ہوش پڑے تھے۔ فائقہ نے ان کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ نوید اور فارحہ رو رہے تھے۔ اسی وقت ندیم ڈاکٹر کو ساتھ لے کر پہنچا۔ معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے انھیں جلد سے جلد ہاسپٹل میں داخل کرنے کا مشورہ دیا لہٰذا بلا تاخیر انھیں ہاسپٹل پہنچایا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے انھیں ICU میں رکھا۔ اس ناگہانی افتاد نے فائزہ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ رات دن گھر اور

ہاسپٹیل کے چکر لگاتے ہوئے اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ سارے پیسے جو شادی کے لیے پس انداز کیے گئے تھے وہ پانی کی طرح بہہ رہے تھے۔ وہ ایک ہفتہ تک موت وزیست کی جنگ لڑتے رہے لیکن آخر موت نے زیست کو شکست دے دی۔ فائزہ چکرا کر لاش ہی پر گر گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ ساکت ہو چکی تھی۔ اس ایک ہفتہ کے درمیان اس نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ اب آنسوؤں کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ وہ کبھی لاش کی طرف دیکھتی اور کبھی بھائی بہنوں کو گلے سے لگاتی۔ وہ ایک بڑی آزمائش میں گھر چکی تھی اور بہر حال اسے اس آزمائش سے گزرنا تھا۔ اس کی ساری زندگی اس کے سامنے پڑی تھی۔ اس نے اچھی پوزیشن حاصل کی تھی لیکن کون ایسی شفیق ہستی تھی جس کے ساتھ وہ اپنی خوشی شیئر کرتی۔ اب اسے اتنا ہوش ہی کہاں تھا..... اتنی فرصت ہی کب تھی۔ اس کے ناتواں کندھوں پر تو بڑی بڑی ذمہ داریاں آ گئی تھیں۔ بھائی بہنوں کی پرورش پرداخت، تعلیم وتربیت، شادی بیاہ..... اس کا ذہن منتشر سوچوں کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔

بہت غور وفکر کے بعد اس نے مکان کا کچھ حصہ کرائے پر لگا دیا۔ اور گھر میں تعلیمی ادارہ قائم کیا جہاں بچے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے۔ لیکن یہ بھی ناکافی تھا لہٰذا جب بھی ویکینسی نکلتی تو جھٹ درخواست دے دیتی۔ ہر جگہ انٹرویو کے لیے بھی جاتی۔ گویا پیہم جدوجہد کرتی رہی اور بالآخر ایک پرائیوٹ اسکول میں اسے جاب مل گئی تو اسے قدرے سکون ہوا۔ ندیم اور فائقہ میٹرک کرنے کے بعد کالج پہنچ گئے تھے۔

اس دوران آمنہ خالہ کبھی کبھی ڈھکے چھپے لفظوں میں شادی کا ذکر کر لیا کرتی تھیں لیکن ایک دن تو وہ خاص اسی مقصد کے لیے پہنچ گئیں۔ فائزہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"آج میں تم سے کچھ خاص بات کرنے آئی ہوں۔ حالانکہ اس موضوع پر تم سے بات کرنا بہت ہی نامناسب لگ رہا ہے لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔ تم خود سمجھدار ہو

اور تم سے بہتر تمھارے بارے میں اور کون سوچ سکتا ہے۔ آخر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ اب تو تمھارے بھائی بہن ماشاء اللہ سمجھدار ہو گئے ہیں۔''

خالہ بہت رسانیت سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

''اب اتنے بھی سمجھدار نہیں ہیں کہ اپنی کفالت خود کر سکیں۔''

فائزہ نے بے حد افسردگی سے کہا۔

''تم تب بھی ان لوگوں کی دیکھ بھال اور سرپرستی کر سکتی ہو۔''

''تب اور اب میں بہت فرق ہوگا خالہ! آپ بزرگ ہیں اور ظاہر ہے مجھ سے زیادہ تجربہ کار بھی ہیں۔ میں یہ مانتی ہوں آپ ہمارے ساتھ بہت ہی مخلص بھی ہیں لیکن حالات خود بخود ایسے پیدا ہو جائیں گے کہ میں چاہ کر بھی ان لوگوں کے لیے کچھ نہ کر پاؤں گی۔ نہیں خالہ نہیں! میں اپنے بھائی بہنوں کو بے سہارا نہیں چھوڑ سکتی۔'' اس دن خالہ کچھ رنجیدہ کچھ افسردہ واپس چلی گئیں۔ لیکن اب تقاضے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ہر بار اس کا جواب نفی ہی میں ہوتا۔

اسے اس بات کا اندازہ بالکل نہ تھا کہ زندگی کی راہ گزر پر اتنے نشیب و فراز آئیں گے، اتنی دشواریاں پیدا ہوں گی۔ اتنے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ اس نے تو سوچا تھا کہ زندگی کے اس اہم تقاضے اور مطالبے سے منہ موڑ کر بھی وہ اپنی زندگی کے باقی ایّام اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ ہنسی خوشی گزار لے گی۔ لوگ اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کا مشورہ دیتے لیکن اس کا بس ایک ہی جواب ہوتا۔

''اگر کوئی کچھ کر سکتا ہے تو تھوڑا اور انتظار کر لے۔''

یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی کسی کے لیے کب تک انتظار کر سکتا ہے۔ اور پھر کبھی کبھی وہ سب ہو جاتا ہے جسے کوئی خواب و خیال میں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ لوگ کہتے ہیں تقدیر کے ساتھ تدبیر کا دخل بھی لازمی ہے لیکن اکثر تقدیر تدبیر پر اتنی حاوی

ہو جاتی ہے کہ انسان کے لاکھ ارادے اور خواہش کے باوجود وہ ہو جاتا ہے جو کاتب تقدیر اس کی قسمت میں لکھ دیتا ہے اور انسان اتنا بے دست و پا اور لاچار ہے کہ بلا چوں و چرا اس لکھے کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس کے ٹیبل پر عمران کی شادی کا کارڈ پڑا تھا۔ اس نے حسرت سے کارڈ کی طرف دیکھا۔ آج ہی اس کی بارات تھی۔ پڑوس میں رونق ہی رونق تھی لیکن اس کے اندر بیکراں سناٹا تھا۔ ایک عجیب سی احساس محرومی نے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے اُٹھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ ابا کی آواز کی بازگشت اس کے ذہن کے نہاں خانے میں اُبھری۔

"آپ میرے لیے اتنا نایاب تحفہ لے کر آئیں ہیں اور میں انکار کر دوں۔ یہ تو کفرانِ نعمت ہے۔"

لیکن حالات نے اسے اس قدر بے بس کر دیا کہ وہ اس تحفہ کو قبول نہ کر سکی۔ اس کے لیے کسے موردالزام ٹھہراتی؟ صحیح معنوں میں کوئی بھی قصوروار نہ تھا۔ امّی ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ یہ سب تو قدرت کے ہاتھوں کا کھیل ہے۔ کچھ لوگ اپنی جھولی ہی میں بدقسمتی اور ناکامیوں کی سوغات لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ اچانک بہت سارے آنسو اس کی آنکھوں کے کنارے سے چشمے کے مانند پھوٹ پڑے۔

پھر دھیرے دھیرے وہ نارمل ہوتی گئی کہ وقت سب سے بڑا معالج ہے۔ ندیم بی کام کرنے کے بعد کمپٹیشن کی تیاری میں جٹ گیا تھا۔ فائقہ نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے ندیم کے رنگ ڈھنگ کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ سارا سارا دن غائب رہتا۔ رات دیر سے گھر لوٹتا۔ ہر ہفتہ اسے پیسے کی ضرورت پیش آ جاتی۔ وہ جب تک رات کو واپس نہیں آ جاتا فائزہ فکرمند رہتی۔ ایک دن تو اس نے حد ہی کر دی۔ جب رات کے دو بجے گھر لوٹا تو فائزہ میں مزید برداشت کی

طاقت نہ رہی۔ اس نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔

''یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا؟ گھڑی دیکھی ہے تم نے؟؟''

''ہاں دیکھی ہے۔ میں باہر آوارہ گردی کے لیے نہیں رہتا۔ رات کی کوچنگ کلاس کرتا ہوں۔ اگر گھر بیٹھ گیا تب تو ہوگئی میری تیاری۔ آپ میرے لیے فکرمند نہ ہوں۔ اب میں بچہ نہیں ہوں۔ اب آپ کی انگلی پکڑ کر نہیں چل سکتا۔'' اس کے تیور بالکل بدلے ہوئے تھے۔ وہ اس کے اس انداز تخاطب پر حیرت زدہ تھی۔

''کیا یہ وہی لڑکا ہے جو کبھی نظریں ملا کر بات کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی غرض ہوتی تھی تو گلے میں بانہیں ڈال کر پیار سے اپنی بات منوالیا کرتا تھا۔''

دن گزرتے رہے لیکن ندیم کی روٹین اور رویّے میں کوئی فرق نہ آیا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اسے بینک میں جاب مل گئی۔ یہ ایک بڑی بات تھی۔ ایک بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر چکا تھا۔ اسے بھائی کی کامیابی پر جتنی خوشی تھی اس سے زیادہ اس بات کا اطمینان تھا کہ اب ذمہ داری کی گاڑی چلانے کے لیے وہ تنہا نہیں رہی لیکن برسرروزگار ہونے کے بعد اس کا انداز اور بھی بدل گیا تھا۔ اس کے اسی انداز نے فائزہ کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔

وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ لیکن ندیم نے بہت جلد اسے اس الجھن سے نکال دیا۔

''آپا! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''کوئی خاص بات؟'' فائزہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''ایسا ہی سمجھ لیجیے۔ وہ بات یہ ہے آپ کہ میں ایک لڑکی کو پسند کرنے لگا ہوں۔ اب اس کے گھر والے شادی کے لیے تقاضہ کررہے ہیں۔''

''اوہ! تو یہ بات ہے۔ تب ہی کہوں کہ میرا بھائی اتنا بدلا بدلا کیوں لگ رہا

ہے۔ میں تو پہلے فائقہ کی ذمہ داری سے سبک دوش ہونا چاہتی تھی۔ تم ان لوگوں سے کہو کہ فائقہ کی شادی تک انتظار کریں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھیں مجھ سے ملواؤ۔ ڈائرکٹ بات کراؤ۔ پتہ تو چلے وہ کون ہیں؟ کیسے لوگ ہیں؟؟"

"میں آپ کو ان لوگوں سے ملوا تو دوں گا لیکن میرا خیال ہے وہ زیادہ دنوں تک انتظار نہ کریں گے۔"

چند دنوں بعد ندیم نے پھر اسی موضوع کو چھیڑا۔

"آپا! وہ لوگ کسی قیمت پر انتظار کرنے کے لیے راضی نہیں ہو رہے ہیں۔"

"کیوں بھئی! آخر انھیں اتنی جلدی کیوں ہے؟ وہ تمھاری بات ماننے کے لیے تیار نہیں اور تم ان کی بات ماننے پر مجبور ہو، کیوں؟ کہہ دو اگر وہ انتظار نہیں کر سکتے تو نہ کریں ہمارے پیش نظر سب سے پہلے اپنی بہن کا مستقبل ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا! میں اپنی محبت اپنی خوشیوں کو ذمہ داری پر قربان نہیں کر سکتا۔ ہر انسان کو اپنی زندگی اپنے طریقے اور اپنی خواہشوں سے جینے کا حق حاصل ہے۔"

"تو گویا تم نے سب کچھ طے کر ہی لیا ہے۔"

اندرونی کرب سے اس کا ہرہ پل پل رنگ بدل رہا تھا۔

پھر ہزار سمجھانے کے باوجود وہ اپنے من کی کر کے ہی رہا۔ بہو کیا آئی کہ گھر کی فضا ہی بدل گئی۔ جیسے اپنوں کی محفل میں کوئی اجنبی آجائے۔ ایک نامانوس سا احساس تھا۔ شاید یہی احساس اُسے بھی تھا تب ہی تو شوہر کے سوا اسے گھر کے کسی فرد سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ فائزہ ساری ذمہ داریاں نبھاتی رہی۔ صبح سے شام تک چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ مغز ماری کرنے کے بعد وہ اتنا تھک جاتی کہ نہ اس کے جسم میں کوئی سکت رہتی نہ دماغ میں۔

ایک روز کی بات ہے۔ فائزہ صبح سویرے بیدار ہوئی اور کسی ضرورت کے تحت اس کا جانا ندیم کے کمرے کی طرف سے ہوا تو اندر سے چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں آتی سنائی دیں۔ وہ رک گئی۔ ندیم خاموش تھا مگر اس کی بیوی غصہ بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''یہ گھر ہے یا پاٹھ شالہ۔ نہ دن میں چین نہ رات میں سکون۔ جانے لوگ اس گھر میں رہ کر کیسے گزارہ کر لیتے ہیں۔ میں اب ایک دن بھی یہاں رہنے والی نہیں۔ تمھیں دونوں میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا۔ یا میں یا تمھارے بھائی بہن۔''

ندیم کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا جیسے اس کی قوت سماعت اور قوت گویائی دونوں مفلوج ہو چکے ہوں۔ فائزہ زیادہ دیر تک وہاں پر نہ ٹھہر سکی اور لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب مُڑ گئی۔

اسے بہو کی باتوں کا اتنا صدمہ نہ تھا جتنا دکھ اس بات کا تھا کہ اس اپنا سگا بھائی اس کی دفاع میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ انھی بھائی بہنوں کے لیے اس نے زندگی خوشیوں سے منہہ موڑ لیا تھا۔ یہ قربانی اس نے ایسے وقت میں دی تھی جب دل میں ہزاروں تمنائیں جنم لیتی ہیں، ہزاروں خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ اس وقت انسان کو اپنی ذات کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت وہ صرف اپنے لیے جیتا ہے، اپنی خوشی کو مقدم سمجھتا ہے لیکن اس نے بھائی بہنوں کے لیے اپنی ساری خوشیاں قربان کردیں۔ اب اس کی ساری خوشیاں انھی سے وابستہ تھیں۔ وہ انھیں ہنستے مسکراتے دیکھتی تو اس کی ساری تھکن کافور ہو جاتی۔ لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی ساری قربانیاں رائگاں چلی گئیں۔ اس نے اپنی زندگی میں کیا کھویا، کیا پایا اس کا تجزیہ کرنے میں لمحہ لمحہ ماضی کی یادیں دل میں نشتر بن کر چُبھنے لگیں۔

دوسرے دن فائزہ نے موقع پا کر ندیم کو سمجھانے کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''اگر تمھاری بیوی ہم لوگوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو تم بخوشی الگ ہو جاؤ۔ تمھیں حالات سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے۔ تلخیاں بڑھانے سے کیا فائدہ؟'' یہ بات اس نے دل پر پتھر رکھ کر کہی تھی لیکن ندیم شاید اسی کا منتظر تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کے رنگ بکھر گئے۔

رخصت کرتے وقت اس نے بھائی کو گلے لگا کر کہا۔

''میری دعائیں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گی۔ تم دور رہ کر بھی میرے قریب رہو گے۔ گھروں کے فاصلے دلوں کے فاصلے نہیں بڑھا سکتے۔''

لیکن یہ اس کا محض خیال خام تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فاصلے بھی بڑھتے گئے۔ وہ بھائی کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس گئی۔ اور اب اس کا دل یہ سوچ کر لرزتا تھا کہ کہیں دوسرے بھائی بہن بھی اس کے ہاتھوں سے نہ نکل جائیں۔ لیکن یہ تو ہونا ہی تھا۔ ایک دن فائقہ نے کہا۔

''آپا! شاہد آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''کون شاہد؟ میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتی۔''

''وہ میرا کلاس فیلو ہے۔''

''مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟''

''یہ تو وہی بتائے گا۔'' فائقہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

فائزہ ایک لمحے میں ساری بات سمجھ گئی اور پھر فائقہ کی خواہش کے مطابق وہ شاہد سے ملی اور اس کے گھر والوں سے بھی۔ لوگ اچھے تھے۔ رشتہ مناسب تھا لہذا اس نے فوراً حامی بھر لی۔ وہ بہت خوش تھی۔ فائقہ نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

اور پھر فائقہ کی شادی ہو گئی۔ اس نے خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے درمیان فائقہ کو رخصت کیا اور اس کی جدائی کے بات وہ کئی دنوں تک چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔

اب صرف تین نفوس اس گھر میں رہ گئے تھے۔ نوید اور فارحہ تو اس کے دائیں بائیں بازو تھے۔ اب اس کے پاس کل یہی اثاثۂ حیات بچا تھا۔

وقت نے کچھ اور فاصلہ طے کیا۔ نوید نے بی اے پاس کر لیا مگر گریجویشن کے بعد نوید نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اسے باہر جانے کی دھن سوار تھی۔ دن رات اسی تگ و دو میں لگا رہتا اور بالآخر وہ مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد گھر کا سناٹا مزید گہرا ہو گیا۔ یہی غنیمت تھا کہ کبھی کبھار وہ بہنوں کی خیر خبر لیتا رہتا اور گاہے بگاہے کچھ پیسے بھی بھیج دیا کرتا۔ ایک بار اس نے خط میں لکھا کہ ''آپا! مجھے ایک بہت اچھا چانس مل رہا ہے۔ ایک صاحب جو گرین کارڈ ہولڈر ہیں انھوں نے اپنی لڑکی کے لیے مجھے پسند کر لیا ہے اور مجھے امریکہ لے جانا چاہتے ہیں۔ میں یہ چانس مس نہیں کرنا چاہتا۔ امید کہ آپ مجھے بخوشی اس کی اجازت دے دیں گی۔''

وہ سکتے میں آ گئی۔ سوچنے سمجھنے کی وقت زائل ہو گئی۔ اور اب زیادہ سوچنے کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ چلو غنیمت ہے کہ اس نے رسماً ہی سہی اجازت تو مانگی۔ اگر وہ اسے بغیر اطلاع دیئے شادی کر کے امریکہ چلا جاتا تو وہ کیا کر لیتی۔ اور پھر اس نے بھائی بہنوں کی راہ کب کھوٹی کی ہے۔ وہ تو انھی کے لیے جی رہی تھی۔ یہ بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے کہ اس کے بھائی بہنوں میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ اپنی زندگی کی راہیں خود متعین کر رہے ہیں اور اس کے بوجھ کو ہلکا کر رہے ہیں۔ کیا ہوا اگر وہ اس کی نظروں سے دور ہیں۔ وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ شاد رہیں، آباد رہیں۔ (آمین)

اس کے دکھے ہوئے دل سے بے ساختہ دعا نکلی۔

اب صرف فارحہ بچی تھی۔ اس کی آخری ذمہ داری۔ فارحہ بچپن ہی سے کم سخن اور نیک تھی۔ اسے گھر کے کاموں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ خوبصورت تھی اور خوب سیرت بھی۔ اس کے رشتے آنے شروع ہوئے تو فائزہ آنے والے دنوں کے خوف سے ڈر

گئی۔فارحہ کی شادی ہو جانے کے بعد؟؟؟اس سے آگے سوچنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔تنہائی کا عفریت منہہ کھولے سامنے کھڑا تھا۔گزرتے وقت کے ساتھ آنے والی تنہائی کا خوف شدت اختیار کرتا جار ہا تھا۔مایوسیاں اس کی ذات کو اپنی گرفت میں جکڑتی جا رہی تھیں۔لیکن فرض سے آنکھیں چرانا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔اس نے ایک مناسب رشتہ دیکھ کر فارحہ کے ہاتھ پیلے کر دیئے۔اور جس وقت فارحہ رخصت ہو رہی تھی اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا آخری سہارا ابھی اس سے چھوٹا جا رہا ہے۔اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے فارحہ کو گاڑی میں بٹھایا اور ٹوٹے قدموں سے اپنے کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔مگر اس کے اندر باہر ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔اسے ابھی بھی بہت سارے کام سمیٹنے تھے لیکن اب اس کے اندر اُٹھنے کی سکت بھی باقی نہ بچی تھی۔اس نے ایک لمبی مسافت طے کی تھی۔اور راستے میں آنے والے روڑوں کو ہٹاتے ہٹاتے اس کے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے پھر بھی اسے منزل نہ مل سکی۔دوسروں کو منزل تک پہنچاتے پہنچاتے وہ خود اپنی منزل کا نشان کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

کوئی منزل نہیں

گاڑی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ میں کھڑکی سے لگی اپنے خیالوں میں گم لمحہ لمحہ اس شہر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس شہر سے..... جہاں یہ خوف غالب تھا کہ اگر کچھ دن اور یہاں رہ گئی تو بدنامی اور رسوائی کے چھینٹے میرے دامن کو داغدار کر دیں گے۔

گاڑی اب شہر کی حدود کو پار کر چکی تھی۔ میں نے ایک لمبی اطمینان بخش سانس لی۔ میں اب پر سکون نیند سونا چاہتی تھی۔ لیکن گزرے ہوئے واقعات گاڑی کی چھک چھک سے ہم آہنگ ہو کر دل و دماغ پر ٹھوکریں لگا رہے تھے۔

میری گذشتہ زندگی آج سے بہت مختلف تھی۔ میں تو عیش و عشرت میں جی رہی تھی۔ شاہانہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اس عیش و عشرت کے پس پردہ کیا راز ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا خود کو ایک بنگلہ نما مکان میں ماں اور چند نوکروں کے درمیان پایا۔ سرپرست کے طور پر کسی مرد کا وجود نہ تھا۔ ایک تصویر میرے کمرے میں لگی تھی جسے میری ماں نے میرے باپ کی حیثیت سے مجھے روشناس کرایا تھا۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا اور انھوں نے اتنی رقم چھوڑی تھی جو ہماری پرورش کے لیے کافی تھی۔ اور یہ سچ بھی تھا کہ روپے پیسے کی کمی کبھی محسوس نہ ہوئی۔ لیکن یہ بات مجھے اکثر افسردہ کر دیتی

کہ ہمارا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ ہمارا آنا جانا بھی کہیں نہ تھا۔ ہاں! ماں کبھی کبھی سوشل ورکر کی حیثیت سے یا اس قسم کی پارٹیوں میں شرکت کے لیے جایا کرتی تھیں۔ ایک شخص ہمیشہ ہمارے یہاں آیا کرتے تھے جن کے بارے میں ماں نے بتایا تھا کہ وہ ہمارے منیجر ہیں۔ منیجر انکل کو میں بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی۔ وہ ایک مخلص شخص تھے۔ مجھے بہت پیار کیا کرتے تھے۔ میں بھی ان سے کافی مانوس تھی۔ ماں کسی کسی موضوع پر گھنٹوں ان سے باتیں کرتی رہتیں۔ لیکن ان باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں تو اپنی دنیا میں مست ہنستی کھیلتی اسکول سے کالج تک پہنچ گئی تھی۔

ماں آزادیٔ نسواں کے سخت خلاف تھیں۔ مجھے ہمیشہ نصیحت کرتیں کہ میں اپنے کلاس فیلوز سے زیادہ میل جول نہ رکھوں۔ لہذا ہائے ہیلو سے آگے قدم بڑھانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ کیونکہ میرے لیے اپنی ماں کا ہر حکم حرف آخر کا درجہ رکھتا تھا۔

مجھے کالج میں داخلہ لیے ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ اور اب اگزام ہونے والے تھے۔ کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ ایک لڑکا پڑھائی سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کی نظریں ہر وقت مجھ پر ٹکی رہتیں۔

''گستاخی معاف! کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں۔'' بالآخر اس نے راہ ورسم بڑھانے کی شروعات کر ہی دی۔

''میں صبا ہوں اور آپ؟''

''ناچیز کو سلمان کہتے ہیں۔ حال ہی میں اس کالج میں منتقل ہوا ہوں۔''

پھر وہ اکثر مجھ سے کوئی نہ کوئی سوال کرتا اور میں مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جایا کرتی۔

''شاید آپ کو بولنے کی عادت کم ہے۔'' وہ بات سے بات نکالتا۔

''دیکھئے مسٹر! میں یہاں پڑھنے کے لیے آتی ہوں، فضول گوئی کے لیے نہیں۔''

لیکن وہ بڑا ڈھیٹ تھا۔ کامن روم ہو یا کالج کا کمپاؤنڈ، ہر جگہ مجھ سے

بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا۔ لاچار مجھے اس کی باتوں کا جواب دینا ہی پڑتا۔ اسی طرح راہ ورسم بڑھتی گئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ لیکن ماں کی نصیحت میرے ذہن کے کسی کونے میں محفوظ تھی لہٰذا میں نے اس دوستی اور بے تکلفی کو حد سے بڑھنے نہ دیا۔ میرا خیال تھا کہ گریجویشن کرنے کے بعد میں اس کا ذکر ماں سے کروں گی۔ ان سے ملواؤں گی اور انھیں بتاؤں گی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اب یہ موقع آ گیا تھا۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے ماں کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ نہ جانے انھیں کون سا مرض لگا تھا کہ وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ علاج ہو رہا تھا لیکن کوئی افاقہ نہ تھا۔ نہ جانے کون سا غم تھا جو انھیں روز بروز موت سے قریب کرتا جا رہا تھا۔ تنہائی کا غم، اپنوں سے جدائی کا یا پھر شوہر کی بے وقت موت کا غم۔ ایک رات انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہا۔

" آج میں جو کچھ تمھیں بتانے جا رہی ہوں اسے سن کر شاید تمھارے دل میں میرے لیے شدید نفرت پیدا ہو جائے۔ لیکن بتانا ضروری اس لیے تھا کہ میری طرح تمھاری نادانی بھی تمھیں نہ لے ڈوبے۔ میں چاہتی تھی کہ یہ راز میرے ساتھ دفن ہو جائے۔ لیکن زندگی نے مجھے مہلت نہ دی۔ اب ہر قدم تمھیں خود ہی سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے۔ دنیا کے مکر وفریب سے خود کو بچانا ہے۔ یہ دنیا جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔ صرف پرکھنے کی ضرورت ہے۔ میں بہت ہی نادان اور ناسمجھ تھی۔ اس وقت میں اپنے کالج کی تیز طرار لڑکی تھی۔ ہر سرگرمی میں پیش پیش رہنے والی۔ ہر مقابلے میں حصہ لینے والی۔ چاہے وہ ڈیبیٹ ہو یا ڈراما یا کوئی بھی کلچرل پروگرام۔ اور وہ جو میری تباہی کا باعث بنا، اسی کالج کا ایک سابق اسٹوڈنٹ تھا لیکن اب بھی وہاں اس کی شخصیت نمایاں تھی۔ ہر تقریب کا صدر منتخب کیا جاتا۔ لمبی لمبی تقریریں کرتا۔ اسی کے ہاتھوں انعامات تقسیم کروائے جاتے۔ مجھے بھی اس کے ہاتھوں انعام لینے کا اتفاق ہوا اور یہ اتفاق کئی بار

ہوا۔ انعام دیتے وقت وہ میری کامیابی پر مجھے مبارکباد دیتا اور بہت ہی گہری نظروں سے مجھے دیکھتا اور میں مقناطیسی کیفیت کے زیر اثر اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ پھر ہم اکثر کالج سے باہر بھی ملنے لگے۔ بلاشبہ وہ غیر محسوس طریقے سے کسی کو بھی متاثر کرنے کا فن جانتا تھا۔ میں اس کے خوبصورت الفاظ کے جال میں پھنستی چلی گئی۔ میں اس کی باتوں کی بھول بھلیّوں میں ایسی گم ہوئی کہ ہر طرف مجھے وہی وہ نظر آتا۔ اس کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ باپ نہ ماں، نہ خاندان، نہ خاندان کی عزت و ناموس۔ اور پھر ایک دن میں اپنے خاندان کی عزت و ناموس کی چادر اتار کر اس کے ساتھ چلی گئی.....

دور، بہت دور۔ اپنے ماں باپ کے دل سے دور..... ان کی شفقت کی چھاؤں سے دور..... ان کے تحفظ سے دور۔ پھر میری دنیا ہی بدل گئی۔ وہ مجھے بڑی بڑی پارٹیوں میں لے جاتا۔ بڑے بڑے لوگوں سے ملواتا اور جب میں اس رنگ میں رنگ گئی تو مجھے اپنے طور پر استعمال کیا گیا۔ میں ان بھیڑیوں کے بیچ بری طرح گھر گئی تھی۔ گناہ کے دلدل میں اتنی دور تک دھنس گئی کہ اب اس سے نکلنا ناممکن تھا۔''

ماں اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ ان کی باتوں نے میرے ہوش و حواس اُڑا دیئے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے کانوں میں سلاخیں گھونپ رہا ہو۔ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ اردگرد کی چیزیں مجھے گردش کرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

دوسرے دن وہ دنیا کے ہر غم سے آزاد ہو چکی تھیں۔ میں ان کی پٹی پر سر پٹک پٹک کر خوب روئی۔ پھر ایک عزم کے ساتھ سر اٹھایا اور اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ ان کے گزر جانے کے بھی منیجر انکل اکثر آتے۔ ایک دن انھوں نے کہا۔

''تم اپنے ابّو کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟''

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ میرے تن بدن میں شعلہ سا بھڑک اٹھا۔

''نہیں! میرا باپ ایک کمینہ شخص ہے۔ اس نے میری ماں کی زندگی برباد

کی۔ مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔'' میں غصے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ کر بولی۔

''انکل آپ میرے ابّو کو جانتے ہیں؟''

''بالکل جانتا ہوں۔''

''آپ نے انھیں اس حادثے کی خبر نہیں دی؟''

''دی تھی۔''

''پھر بھی وہ میرے پاس نہیں آئے۔ ان کی دشمنی ماں سے تھی، مجھ سے تو نہیں۔''

''تم چاہو تو میں تمھیں ان سے ملوا سکتا ہوں۔''

''نہیں! آپ صرف ان کا پتہ مجھے دے دیں۔''

منیجر انکل نے اُن کا پتہ مجھے دے دیا۔ میں کئی روز تک اس اُدھیڑ بن میں رہی کہ مجھے اپنے ابّو کے پاس جانا چاہئے کہ نہیں۔ میں جب بھی ماں کے چہرے پر چھائی اداسی اور ان کی دکھ بھری زندگی کو یاد کرتی تو میرے اندر نفرت کی چنگاریاں بھڑک اُٹھتیں۔ میرے دل میں انتقام کی آگ سلگنے لگتی اور جی میں آتا کہ انھیں قتل کر دوں۔ پھر سوچتی، کیا کسی کی جان لے لینے سے انتقام کی آگ سرد ہو جائے گی؟ میرے دل سے آواز آتی نہیں! تو پھر میں کیا کروں؟ دل میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو کیسے ٹھنڈا کروں؟ میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔

اسی طرح کئی شب و روز گزر گئے۔ پھر ایک دن جب بے چینی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو میں منیجر انکل کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئی۔ رات بے حد تاریک تھی۔ بنگلے پر مکمل سکوت طاری تھا۔ میں گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ برآمدہ پار کر کے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ بستر پر کوئی شخص سو رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہی تھا، بالکل وہی۔ وہی ناک و نقشہ، وہی چہرہ، میرے کمرے میں لگی ہوئی

تصویر سے مشابہ۔شک و شبہہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ میں نے بیگ کھول کر پستول نکالا اور بے دریغ گولی چلا دی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی ایک درد بھری چیخ سنائی دی اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ پورا بنگلہ روشن ہو اُٹھا تھا۔ میں چاروں طرف سے گھر چکی تھی۔ پھر میں چکرا کر بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو اپنے بستر پر پڑی تھی۔

''اُف! کتنا بھیانک خواب تھا۔''

وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا۔ مجھے آگے پیچھے، دائیں بائیں کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ سلمان بھی بہت دنوں سے لا پتہ تھا۔ سچ ہے کہ اندھیرے میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ پھر ایک روز منیجر انکل نے مجھے بتایا کہ میرے ابّو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔

''کہاں؟ اُس نرک میں، جہاں وہ خود رہتے ہیں اور جہاں میری ماں نے دوزخ کی زندگی گزاری تھی۔ جس شخص نے میری ماں کی قربانی، ایثار، وفا، عزت اور اعتماد کو تار تار کر دیا وہ انسان بھروسے کے لائق نہیں۔ نہیں! میں وہاں نہیں جاؤں گی، کبھی نہیں۔''

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جس پیار اور شفقت کے لیے میں عمر بھر ترستی رہی وہی پیار اور تحفظ جب مجھے حاصل ہو رہا تھا تو میرا دل اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کون جانے وہ میرا باپ ہے بھی یا نہیں؟ اور واقعی میرا اندازہ صحیح نکلا۔ وہ شخص میرا باپ نہیں تھا۔ منیجر انکل نے بھی مجھے دھوکہ دینا چاہا تھا۔ انھوں نے میری دولت ہڑپ کرنے کے لیے کسی فراڈ کو میرے باپ کی حیثیت سے مجھے ملایا تھا۔ لیکن میں اس شخص کو دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ میرا باپ نہیں ہے۔ مجھے بہت غصہ آیا اور پہلے تو میں نے منیجر انکل سے 'انکل' کو نکال دیا، پھر منیجر کو بھی نکال دیا۔

اس کے بعد کئی لوگوں نے میرے باپ ہونے کا دعویٰ کیا۔ میں حیران و

پریشان تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان میں سے کون میرا حقیقی باپ ہے۔ مجھے آج بھی اپنے باپ کی تلاش ہے تاکہ میں اس کا گریبان پکڑ کر پوچھ سکوں کہ کیوں پیدا کیا تم نے مجھے؟ میرے نہ ہونے سے دنیا میں کوئی کمی تو نہ آجاتی؟

پھر اپنے وجود کو کئی حصوں میں تقسیم ہونے سے پہلے میں نے اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہنے کا فیصلہ کرلیا لیکن جانے سے پہلے میں ایک بار سلمان سے ملنا چاہتی تھی۔ اگر اس نے مجھے اپنا لیا تو میں زندگی بھر کے لیے اس کی ہو جاؤں گی۔ ایسا میں نے اپنے دل میں سوچا۔ اور پھر ایک روز میں سلمان کے دروازے پر جا پہنچی۔ کال بیل دبانے پر ایک ملازم نے دروازہ کھولا اور مجھ سے پوچھا کہ میں کس سے ملنا چاہتی ہوں۔ جب میں نے سلمان کا نام لیا تو اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک جوان عورت میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور متجسس نظروں سے مجھے دیکھنے لگی اور پھر میرے آنے کا مقصد دریافت کیا۔

''مجھے سلمان سے ملنا ہے۔''

''لیکن وہ تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''آپ کا تعارف؟'' میں نے کھوجتی نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں مسز سلمان ہوں۔'' اس سے آگے میں کچھ اور نہ سن سکی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس شہر میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہ رہی تھی۔

ساری رات ماضی کی بھول بھلیّوں میں گزر گئی۔ اب صبح ہو رہی تھی۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر ٹوائلٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ہر طرف سے چائے والوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ گاڑی دیر سے رکی ہوئی تھی۔ شاید کوئی بڑا اسٹیشن تھا۔ لوگ اُتر رہے تھے اور چڑھ رہے تھے۔

لیکن مجھے کہاں جانا ہے؟ میری تو کوئی منزل ہی نہیں۔

☆☆☆٥

ہونی انہونی

جب اس نے سنا کہ نانا نے شادی کر لی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

''یہ نانا کو کون سا شوق چرایا۔''

وہ اس کے رشتہ کے نانا لگتے تھے۔ نانی کو گزرے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ پوری زندگی انھوں نے تنہا گزار دی اور اب اس عمر میں انھیں نہ جانے یہ کیا سوجھی۔

کچھ لوگوں نے ان کی حمایت کی۔

''ٹھیک ہی تو کیا بڑے میاں نے۔ اولاد بھی نہیں تھی۔ بڑھاپے میں کون دیکھ بھال کرتا۔ کون خدمت کرتا؟''

کسی نے مخالفت میں کہا۔

''اگر شادی ہی کرنی تھی تو کسی ادھیڑ عمر بیوہ سے کر لیتے۔ سنا ہے کہ وہ تو ایک نوخیز کلی توڑ لائے ہیں۔''

غرض جتنی زبانیں اتنی ہی باتیں، اتنے ہی تبصرے۔ ایک دن وہ نانی کو دیکھنے کے اشتیاق میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ نانا برآمدے میں کرسی پر نیم دراز تھے۔ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھے۔

''ارے عامر میاں! آؤ آؤ!! بھئی کیا خوب آئے۔ ابھی میں تمھیں ہی یاد کر رہا تھا۔''

انھوں نے بڑی گرم جوشی سے اسے گلے لگایا اور اسے ساتھ لیے اندر آ گئے۔

کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی خیر خیریت کے بعد پوچھا۔

''نانی سے ملنے آئے ہو؟''

وہ خاموش رہا۔ اسے نہ ہاں کہتے بن رہی تھی نا نہ کہتے۔ لیکن نانا نے جلد ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

''بیگم! ادھر آؤ۔ دیکھو تو کون تم سے ملنے آیا ہے۔'' تھوڑی دیر میں ایک نازک اندام میانہ قد اور معصوم چہرے والی لڑکی سر پر پلو ڈالے لجاتی شرماتی کمرے میں داخل ہوئی جسے دیکھتے ہی اسے سکتہ سا ہو گیا۔ ایک بار نانا نے پھر اس کی مشکل آسان کر دی۔

'ارے بھئی! منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ نانی کو سلام کرو۔''

اور وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

''السلام علیکم!''

جس کم سن لڑکی کا تعارف ''نانی'' کے طور پر کروایا گیا تھا اس نے اس کے سلام کا جواب لفظوں میں نہ دیا بلکہ اس نے ایک ادا کے ساتھ سر کو ذرا خم کیا اور اپنی مخروطی انگلیوں کو پیشانی تک لے گئی۔

''ارے بھئی ایسے نہیں۔ دعائیں دو۔ یہ تمھارے عزیز ہیں۔''

انھوں نے رشتے کی اہمیت جتائی۔ حالانکہ وہ اس سے دو چار سال چھوٹی ہی ہو گی۔ پھر ''نانی'' نے بڑے سلیقے اور اہتمام سے چائے ناشتے کا انتظام کیا۔ اور وہ اس بے میل جوڑی پر کف افسوس ملتا رہا۔ پھر بوجھل دل سے لوٹ آیا۔ اور سوچتا رہا کہ آخر کون سی کمی یا مجبوری تھی کہ اس غریب کو اس بڈھے کے پلو باندھ دیا گیا۔ پتہ چلا کہ یکے بعد دیگرے سات بیٹیوں کی پیدائش پر ماں

باپ بوکھلا گئے ۔ جب کوئی نئی بچی جنم لیتی تو ان کی مایوسیوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔ پاس پڑوس رشتے ناطے والے سمجھاتے۔

"لڑکیاں تو رحمت ہوتی ہیں۔ خدا جس سے خوش ہوتا اسے ہی یہ نعمت عطا کرتا ہے۔ جو شخص اچھی طرح لڑکیوں کی پرورش کر کے ان کی شادی کرتا ہے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔"

لیکن لڑکیاں جہنم میں جھونک دی جاتی ہیں۔ کبھی وہ کسی اپاہج سے بیاہ دی جاتی ہیں اور کبھی کسی بڈھے سے۔

یہ جہنم ہی تھا جہاں وہ دوہری زندگی جی رہی تھی ۔ دن کے اُجالے میں وہ منافقت کا لبادہ اوڑھے چہرے پر مصنوعی بشاشت لیے لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ۔لیکن رات کی سیاہی کی طرح اس کا مقدر بھی سیاہ اور تاریک تھا۔ رات اس کے لیے قیامت بن کر آتی ۔ جب وہ بستر پر لیٹتی تو انوکھے احساسات اسے بے کل کر دیتے اور وہ جذبوں کے اس گرداب میں ڈوبتی چلی جاتی ۔ بستر پر کانٹے سے چبھنے لگتے اور کروٹ بدلتے بدلتے اس کا بدن پھوڑوں کی طرح دکھنے لگتا۔ مشکل سے جو ذرا آنکھ لگتی تو اسے ایسا لگتا کہ ارد گرد کوئی ہے جو اسے اٹھا رہا ہے۔ ہاتھوں کے لمس سے اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔ لیکن کہیں کوئی نہ ہوتا۔ نہ کوئی آہٹ ، نہ کوئی آواز۔ صرف بڑے میاں کے کھانسنے کی آواز اس کے کانوں کے پردوں پر ہتھوڑے برساتی ۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کر کے اپنے اس خیالی پیکر کی آغوش میں سمٹ کر دنیا کی ہر رنج غم سے نجات پانے کی کوشش کرتی جسے نہ جانے کب سے وہ اپنے دل اور ذہن میں بسائے تھی ۔لیکن حقیقی دنیا میں اس کے لیے ایسا کوئی وجود نہ تھا۔

اس نے سنا تھا کہ اس کا ہونے والا شوہر عمر رسیدہ ہے لیکن اس حد تک نہ سوچا تھا کہ اس کے سارے خواب ایک ہی جھٹکے سے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔

سہاگ رات گھونگھٹ کی اوٹ سے جب اس نے اپنے شوہر کو دیکھا تو اسے

اپنے سینے میں سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سہاگ رات کا فسوں کب ٹوٹا اسے کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ وہ تو اپنے خوابوں کی کرچیاں ساری رات چنتی رہی اور اپنے ارمانوں کی موت پر آنسو بہاتی رہی۔

اس بھولے چہرے اور معصوم اداؤں والی کی کشش نے ایک بار پھر عامر کو نانا کے دروازے پر لا کھڑا کر دیا۔ اس کے آنے سے ماحول خوشگوار ہو گیا۔ نانا تو پرانے قصّے قضئے لے کر بیٹھ گئے۔ اور ''نانی'' بات بے بات مسکرائے جا رہی تھیں۔

''عامر میاں جب بھی تمھیں موقع ملے آجایا کرو کیونکہ تمھاری موجودگی میں تمھاری ''نانی'' بہت خوش رہتی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے میاں کہ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز، کبوتر با کبوتر، باز با باز۔''

اس رات وہ پورے وقت بے کل بے کل سی رہی۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ کبھی ٹہلنے لگتی۔ کبھی بالکونی میں جا کر کھڑی ہو جاتی۔ کہیں پاس ہی ٹی وی پر غزل کا پروگرام آ رہا تھا اور یہ شعر فضا میں گونج رہا تھا:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

دل ناداں کو واقعی قرار نہ تھا اور اس درد کی کوئی دوا بھی نہ تھی:

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

لیکن اس سے کب کسی نے کچھ پوچھا۔ بھیڑ بکری کی طرح ایک کھونٹے میں باندھ دیا۔ یہ نہ سوچا کہ یہ کھونٹا اس کا اہل ہے یا نہیں۔ ساری رات اس کا ذہن انھی خیالوں کی آماجگاہ بنا رہا یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی۔ مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ وضو کیا اور نماز ادا کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ دیر تک دعا مانگتی رہی کہ خدا اسے غلط راستے پر

چلنے سے بچالے۔کوئی انسان بنیادی طور پر برااور بد کردار نہیں ہوتا۔حالات اسے کیا سے کیا بنادیتے ہیں۔یہ خوف اس پر ہر وقت طاری رہتا۔

نانا کی خواہش کے مطابق جب بھی موقع ملتا عامر وہاں پہنچ جاتا بلکہ یوں کہو کہ موقع کی تلاش میں رہتا۔دھیرے دھیرے اس کی آمد کا وقفہ کم ہوتا گیا۔وہ جب بھی آتا تو بات تو نانا ہی سے کرتا لیکن ہر بات کی تان نانی پر آکر ٹوٹتی۔وہ لاپرواہ اور کھلنڈر رسالڑکا اب آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغام رسانی کا کام انجام دینے لگا تھا۔اور خاموش نگاہوں کا پیغام لفظوں کی ادائیگی سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ایک انجانی سی طاقت دونوں کو قریب لانے میں معاون ہوئی۔نانا نے اور بھی موقع فراہم کردیا۔ایک دن کہنے لگے۔

''عامر میاں !تم ذرا بیگم کو ساتھ لے کر بازار چلے جاؤ۔انھیں کچھ خرید وفروخت کی ضرورت پیش آگئی ہے۔اس عمر میں اب میں کہاں دھکے کھاتا پھروں گا۔''

نانا کا حکم بسر وچشم اسے منظور تھا۔شام میں لدے پھندے جب وہ واپس آئے تو ان کے چہروں پر ایک عجیب سی چمک تھی۔پھر یہ ہمیشہ کا معمول بن گیا۔کبھی مارکٹینگ کے لیے اور کبھی کسی اور بہانے سے وہ دونوں باہر نکل جاتے۔اس طرح قربتیں بڑھتی رہیں اور فاصلے کم ہوتے رہے۔اور ایک دن جب بازو والے کمرے سے دونوں کی پراسرار ہنسی کی آواز آئی تو بڑے میاں کی چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ان کے جسم کا سارا خون سمٹ کر آنکھوں میں آگیا۔

''یہ کیا ہوگیا؟''

کسی میں کوئی دم خم ہو یا نہ ہو،اپنی پراپرٹی پر کسی غیر کا قبضہ ہوتے ہوئے دیکھ کر برداشت نہیں کرسکتا۔لیکن انھیں یہ سانحہ برداشت کرنا پڑا کہ یہ ان کی اپنی کمزوری تھی۔ انھوں نے لب سی لیے۔اسی میں عافیت تھی۔یہی مصلحت کا تقاضا تھا۔کیونکہ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور خدشہ تھا کہ اس کی تیز دھارا سب کچھ بہا کر لے نہ جائے اور گھر

کی عزت سر بازار نیلام نہ ہو جائے۔

بڑے میاں کی صحت پہلے سے ہی بہتر نہ تھی۔اب اور بھی کمزور ہوتے جا رہے تھے لیکن پھر بھی ایک چمتکار ہو گیا۔ بڑے میاں کے رعشہ زدہ اعصاب کے باوجود یہ انہونی ہو گئی کہ بیوی امید سے رہ گئیں۔اب وہ دبلی پتلی سی لڑکی گداز جسم، خوبصورت سراپا اور شاداب چہرے والی عورت بن چکی تھی جسے دیکھ دیکھ کر وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے۔

پھر اس نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔اس موقع پر بڑے میاں کو خوشی ہوئی یا کچھ اور یہ تو وہی جانیں۔لیکن لوگ انھیں مبارکباد دے رہے تھے کہ ان کا جانشیں اس دنیا میں آ گیا۔

☆☆☆

(فنون، ستمبر ۲۰۰۸)

تصویر

مدت بعد یہ تصویر پھر ایک بار اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے یہاں تک پہنچ گئی۔ اپنی یاداشت میں تو اس نے اس شخص کی ساری تصویریں، سارے خطوط اور ساری یادگار چیزیں نذر آتش کر دی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایسا کرنا پڑا تھا ورنہ کوئی عورت اپنی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کی نشانی کو اتنی بے دردی کے ساتھ ضائع نہیں کر سکتی۔ لیکن اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ اس نے سارے نشانات حرف غلط کی طرح مٹا دیئے تھے۔ پھر بھی زمانے کی نظروں میں مجرم اور گنہگار تھی.....آخر کیوں؟

جو جرم اس نے کیا ہی نہیں، جس میں اس کے اپنے ارادے کا کوئی دخل نہ تھا، وہ اس جرم کی مرتکب کیوں گردانی جا رہی تھی؟

پورے دس سالوں تک اس کی کشتی حیات سمندر کی تیز لہروں پر بنا پتوار کے ڈولتی ڈگمگاتی رہی۔ کنارے کی تلاش میں ڈوبتی اور ابھرتی رہی۔ لیکن شومئی قسمت کہ جب کنارہ مل گیا تو باد سموم کی زد میں آ گئی۔ تیز ہواؤں کے تھپیڑے اپنے ناتواں جسم پر سہتی رہی۔ کہیں پناہ نہ ملی۔ جدھر جاتی معنی خیز نظروں کا نشانہ بن جاتی۔ کوئی طنز کے تیر

برساتا تو کوئی زخم پر نمک چھڑکتا۔ کوئی محفل ہو یا کوئی تقریب، اسے دیکھ کر لوگ آپس میں چہ مگوئیاں کرنے لگتے۔ وہ جلد وہاں سے اُٹھ جاتی کہ کہیں کوئی اُس سے اُلٹا سیدھا سوال نہ کر بیٹھے۔ جب بھی جسے موقع ملتا اس کا مذاق اُڑانے سے باز نہ آتا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھولتی مگر کہہ نہ پاتی کہ بتیس دانتوں کے بیچ ایک زبان کس کس کا مقابلہ کرے گی۔ یہ دنیا کب کسی کو خوش دیکھنا گوارا کرتی ہے۔ اسے ایسا لگتا جیسے ساری دنیا، ساری کائنات اس پر انگلیاں اٹھارہی ہے، ہنس رہی ہے، قہقہے لگارہی ہے۔ وہ ادھر اُدھر دیکھتی۔ کہیں راہ فرار نہ ملتی۔ وہ اس ماضی کو بھول جانا چاہتی تھی جو اس کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ بھول جانا چاہتی تھی کہ کل کس حادثے سے وہ گزری تھی۔ گزرے ہوئے ان دنوں، مہینوں اور سالوں کی تلخ یادوں کو فراموش کر کے حال میں جینے کی کوشش کرنا چاہتی تھی لیکن کوئی اسے ایسا کرنے نہیں دیتا۔ اس کے مندمل ہوتے ہوئے زخم کے ٹانکے اس بے دردی سے اُدھیڑے جاتے کہ وہ بلبلا اٹھتی۔ اُٹھتی ہوئی ٹیس اسے کس کل چین لینے نہیں دیتی۔

اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ چچی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے سنا۔ کوئی اُن سے کہہ رہا تھا۔

"اس نے تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق چھوڑا ہی نہیں۔ بھلا اس عمر میں دوسرا بیاہ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ آدھی تو کٹ ہی چکی تھی۔ باقی آدھی بھی کٹ ہی جاتی۔ بہن بھائی کے بچوں کو گلے لگالیتی تو دل بھی بہلا رہتا اور آخری وقت میں وہ کام بھی آجاتے۔" وہ ٹھٹھک گئی۔ چچی کہہ رہی تھیں۔

"کہہ تو تم ٹھیک ہی رہی ہو لیکن جوانی کے اُمنڈتے ہوئے جذبوں پر بند کون باندھ سکتا تھا۔ یہ بھڑکیلے پوشاک، یہ بناؤ سنگار، یہ سینما بائسکوپ....." اس سے آگے وہ اور کچھ نہ سن سکی۔ دل تھام کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں کے کٹورے چھلک پڑے۔ یہ کیسی دل

جلانے والی باتیں ہیں۔ بھڑ کیلے پوشاک کا تو اب تصور بھی نہ تھا۔ بناؤ سنگار کے نام پر صرف صاف ستھرے لباس ہی زیب تن کرتی اور سینما تو شجر ممنوعہ سمجھ کر کب کا چھوڑ چکی تھی۔ کیا زندگی کے تقاضے یہی ہیں؟ کیا اسے ایک چھت کی ضرورت نہ تھی جس کے نیچے بیٹھ کر اسے تحفظ کا احساس ہوتا۔ ایک ایسے شجر سایہ دار کی طلب جس کی ٹھنڈی چھاؤں اور ہواؤں میں سانس لے کر خود کو تر و تازہ محسوس کرتی۔

جب اس کی شادی ہوئی تھی تو اس وقت وہ بہت کم سن تھی۔ نازک اندام اور چھوئی موئی سی۔ اور اس کا شوہر بے حد ہینڈسم اور اسمارٹ۔ وہ اپنی قسمت پر پھولی نہ سماتی۔ شادیاں تو روز ہی ہوتی ہیں مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ زن و شو عاشق معشوق بن کر رہتے ہوں۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اور یوں زندگی سبک رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

جلتی بجھتی یادیں اب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ گزرے ہوئے وقت کا ایک کرب انگیز منظر اس کے تخیل میں آ گیا۔ کتنی حسرت سے اس نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اب تمھارا کیا ہوگا۔''

اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور ہچکیوں سے رو پڑی تھی۔ جس شخص نے محض چند سال قبل اس کا ہاتھ تھاما تھا، پل بھر میں ہی وہ ہاتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا اور اس کے کانوں میں مسلسل آواز گونج رہی تھی۔

''اب تمھارا کیا ہوگا؟''

اس وقت تو وہ کچھ نہ سمجھ سکی تھی۔ یہ تو اس نے بہت بعد میں جانا کہ بنا چھت کی عمارت کتنی نامکمل اور غیر محفوظ ہوتی ہے جہاں آندھی، طوفان، بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک کی زد میں آنے کا خدشہ اور خوف لگا رہتا ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ اسے چھت تو دوبارہ مل گئی تھی لیکن سکون نہ مل سکا تھا۔ شدید خواہش کے باوجود وہ اس کرب سے چھٹکارا نہ پا سکی تھی۔ اگر خوف خدا نہ ہوتا تو بہت قبل ہی وہ اس ظالم دنیا کو خیر باد کہہ چکی ہوتی اور اب جینا اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس کی زندگی کے ساتھ کچھ اور زندگیاں بھی جُڑ چکی تھیں۔

کئی دنوں سے اس کا شوہر کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ اس کی سرد مہری کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن ایک رات خود اس نے اس کی الجھن دور کردی۔

''تم تو کہتی تھیں کہ تم بھول گئی ہو کہ مجھ سے پہلے بھی تمھاری زندگی میں کوئی دوسرا شخص آچکا ہے۔''

''یہ سچ ہے۔''

تو پھر اتنے سارے معاشقے بھرے خطوط تمھاری تجوری میں کیوں پڑے ہیں؟ اب انھیں رکھنے کا کیا جواز ہے؟ کیا میری محبت کافی نہیں؟''

اسکا دل بڑے زور سے دھڑکا۔

''اف! یہ مرد کتنے شقی القلب ہوتے ہیں۔ اپنے معاشقے کا قصہ تو مزہ لے لے کر بیان کرتے ہیں اور عورتوں کی ذرا سی غلطی ہضم نہیں کر پاتے۔''

ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

وہ خاموشی سے اُٹھی اور پھر اس نے سارے خطوط، ساری تصویریں نذر آتش کردیں۔ دل میں ایک کسک سی اٹھی لیکن پھر وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ اس نے سوچا اس کے شوہر کی فیلنگ کچھ غلط نہیں ہے۔ کوئی مرد بھی ساجھے کی محبت برداشت نہیں کرسکتا۔ اور یہ تو اس کی محبت ہی وہ ڈھال ہے جس پر اس نے اتنے سارے وار سہہ لیے ورنہ وہ تو ٹوٹ چکی تھی۔ اسی نے اس کے ریزہ ریزہ اور بکھرے وجود کو سمیٹ لیا تھا۔ یہ

اس کا احسان ہے۔

یہاں تک کہ اس کی دونوں بیٹیاں بڑی ہوگئیں اور اب اسے یہ ڈر تھا کہ ماضی کی داستان کہیں بیٹیوں پر بھی عیاں نہ ہو جائے۔

اس روز صنوبر کا البم دیکھتے ہوئے اس تصویر پر نظر پڑ گئی۔ چاہا کہ اسے نکال کر چھپا دے۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ پاس ہی دونوں بیٹیاں کھڑی تھیں۔ وہ آہستگی کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن فوراً ہی اس کی چھوٹی بیٹی فوزیہ وہی تصویر لیے پہنچ گئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''امّی! پہچانئے تو یہ کس کی تصویر ہے؟ صنوبر آنٹی کہہ رہی تھیں آپ کا اس تصویر سے گہرا تعلق ہے۔''

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ لوگ اب تک اس سانحہ کو بھول نہیں پائے ہیں۔ ماں کو خاموش دیکھ کر فوزیہ نے پھر پوچھا۔

''بتایئے نا امّی! یہ کس کی تصویر ہے؟''

وہ کچھ نہ بول پائی۔ فوزیہ نے اس کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ اپنی رو میں بولتی چلی گئی۔

''تو میں اسے اپنے البم میں لگا دیتی ہوں۔''

ایک دن جب دونوں بیٹیاں اسکول گئی ہوئی تھیں تو اس نے چپکے سے وہ تصویر نکال لی۔ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کیا اب سارے قصّے ختم ہو جائیں گے؟ کیا وہ لوگوں کا منہ بند کر پائے گی؟ دو قطرے آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ شاید یہ آنسو عورتوں کا المیہ ہیں۔

☆☆☆

احساس کی قیمت

شادی کے بعد جو میں لندن گئی تو بس وہیں کی ہو کر رہ گئی اور گھر گرہستی، بچے شوہر کے گرد میرے شب و روز چکر کاٹتے رہے۔ عرصہ بعد جب وطن آئی تو سب سے پہلے مجھے ننھے ماموں کا دھیان آیا اور ان کے ساتھ جڑی ہوئی بہت ساری یادیں بھی تازہ ہو گئیں۔ ان یادوں کے ساتھ ان سے ملنے کی خواہش اور بھی بڑھ گئی۔ جلد ہی میں ان کا اتہ پتہ پوچھ کر ان تک پہنچ گئی لیکن جب ان سے ملی تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ننھے ماموں ہیں جن کا پرکشش سراپا آج بھی میرے ذہن کے نہاں خانے میں کہیں محفوظ تھا۔ اونچا قد، متناسب جسم، گندمی رنگت، گال میں خفیف سا گڈھا، ذہین روشن آنکھیں، دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور گفتگو کرنے کا خوب صورت انداز۔ بھلا ایسی نفیس شخصیت کو کوئی کیسے بھلا سکتا ہے؟ ان کی نفاست پسندی اب بھی برقرار تھی جس کا اندازہ ان کے طرزِ رہائش سے ہو رہا تھا۔ لیکن پورے گھر میں شہر خموشاں کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟''

''کی تھی۔''

''تو کوئی نظر نہیں آ رہا ہے؟''

''کوئی ہو تو نظر آئے۔''ان کی آواز میں کرب اور آنکھوں میں یاسیت تھی۔

''کہاں گئے سب؟''

''بچے تو خیر ہوئے ہی نہیں اور بیوی سے بہت جلد علیحدگی ہوگئی۔''

''کیوں؟''میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہم دونوں دو الگ الگ راستے کے مسافر تھے۔زیادہ دور تک ساتھ نہیں چل سکے۔''

''اوہ! بہت افسوس ہوا آپ کی یہ ٹریجڈی جان کر۔''

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لیے میں نے ہی سکوت توڑا۔

''آپ کو نشو آیا یاد ہیں؟''انھوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔اُف! ان آنکھوں میں کیسی خاموشی تھی..... کتنی اداسی..... کتنی حسرت..... کسی بہت ہی عزیز شے کے کھو جانے کا دکھ۔کیا کچھ نہیں تھا ان آنکھوں میں۔

انھوں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''جو شے ایک بار دل میں جگہ بنا لیتی ہے وہ اتنی آسانی سے نکل نہیں پاتی۔''

''جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے شاید آپ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔پھر آپ دونوں کے درمیان وہ کون ایسی خلیج تھی جو ناقابل عبور بن گئی؟''

کچھ دیر تک وہ ایک نقطہ پر نظریں جمائے رہے جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں پھر گویا ہوئے۔

''سب سے بڑی خلیج میرے والدین کی مخالفت تھی۔''

''آپ تو ایک بااختیار مرد تھے۔کوئی ٹھوس قدم اٹھا سکتے تھے۔والدین کو قائل کر سکتے تھے۔''

''یہ جنریشن گیپ ہے۔ اب اور تب میں بڑا فرق تھا۔ اس وقت ہم اپنے بزرگوں کی مرضی کے بغیر ''ہوں'' بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بڑی بندشیں تھیں، بڑے مسائل تھے۔ اس وقت ہم اونچ نیچ، ذات پات، امارت غربت، نفرت محبت، احساس برتری اور جھوٹی شان و شوکت کے قید خانے میں مقید تھے۔'' وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''اور بی بی! یہ تمھارا یورپ نہیں ہے جہاں سب سے اہم چیز ذہنوں کی ہم آہنگی ہے۔ باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ کئی معاملوں میں ہم مغربی اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔''

''لیکن آپ دونوں تو ایک ہی خاندان کے تھے۔''

''اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اب گڑے مردے اُکھاڑنے سے کیا فائدہ؟ بہتر ہے کہ ہم اس موضوع کو یہیں ختم کر دیں۔''

پھر وہ دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ اپنے آبائی وطن، اپنے خاندان والوں کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں، ہجرت پھر دیارِ غیر میں قدم جمانے اور راہ میں آنے والی دشواریوں کے بارے میں۔ اس حادثے کے بارے میں جس نے ان کی روح اور جسم کو مجروح کر دیا تھا۔ غیروں کے دلوں میں اپنا مقام بنانے میں وہ کتنے کامیاب اور کتنے ناکام رہے۔ غرض انھوں نے اپنے احساس کا ورق ورق کھول کر میرے سامنے رکھ دیا جن میں مایوسیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر میں اپنے دل پر ان کی ناشاد اور نامراد زندگی کا بوجھ لیے ہوئے پھر ملنے کے وعدہ کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئی۔

ننھے ماموں سے ملنے کے بعد بہت ساری بھولی بسری یادیں تازہ ہو گئیں اور ماضی کے دریچے وا ہو گئے۔

وہ تین سو گھروں پر مشتمل ایک بارونق گانو تھا جہاں ہر فرقے، ہر مذہب کے لوگ شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ وہ میری ننھیال تھی۔ نشو آپا میری خالہ زاد بہن تھیں اور ننھے

ماموں میرے رشتے کے ماموں تھے۔ میں اکثر ان کے گھر جایا کرتی۔ گھر کیا تھا ایک لمبی چوڑی لال اینٹوں سے بنی پختہ حویلی تھی۔ ایک بڑا سا آہنی پھاٹک تھا جس کے اندر داخل ہوتے ہی امارت کا احساس ہوتا۔ سر سبز لان جیسے مخمل کا فرش بچھا ہوا ہو۔ خوش رنگ پھول اور ان کی مہک قدم روک لیتی۔ حویلی کے محراب پر عشق پیچاں کی بیلیں اپنے سرخ سرخ پھولوں کے ساتھ پھیلی ہوئی اپنے مکیں کے صاحب ذوق ہونے کی غمازی کرتیں۔ پوری حویلی صاف ستھری..... ہر چیز سلیقے اور قرینے سے اپنی جگہ رکھی ہوتی۔ مہذب عورتیں گھر کی زینت میں اضافہ کرتیں۔ اس کے برعکس چند چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل میری خالہ کی چھوٹی سے حویلی تھی۔ کہیں کچی کہیں پکی، کہیں چھت کہیں چھپر۔ وسیع صحن لیکن اوبڑ کھابڑ جس میں بیلی، چنبیلی، موگرا، موتیا اور مہندی کے جھاڑ لگے تھے۔ آم، امرود، لیموں اور کلوندا کے بھی چند پیڑ بے ترتیبی سے لگے ہوئے تھے۔ بیچ صحن میں ایک چوبی تخت بچھا رہتا تھا۔ ننھے ماموں گو کہ وہ بہت ہی نفیس شخصیت کے مالک تھے پھر بھی وہ اکثر اسی تخت کی گرد جھاڑ کر بیٹھ جاتے۔ ننھے ماموں ہمیشہ بے شکن سفید پوشاک پہنے رہتے اور نشو آپا بیچاری سیدھی سادی سی بندی..... لیکن تھیں غضب کی حسین تھیں۔ آنکھیں ایسی نشیلی کہ اگر ایک بار کسی کی طرف اُٹھ جائیں تو وہ بے چارہ بے موت ہی مر جائے۔ زلفیں اتنی دراز، سیاہ اور چمکیلی کہ اگر کوئی ایک بار ان میں اُلجھ جائے تو پھر نکلنے کا راستہ نہ پائے۔ ننھے ماموں بھی شاید انھیں نشیلی آنکھوں کے شکار اور زلف گرہ گیر کے اسیر ہو چکے تھے۔ نشو آپا کو بھی ان سے کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے ان کے پاس جاتیں۔ کبھی گلوریاں پیش کرتیں تو کبھی چائے۔ جب کبھی ننھے ماموں نہیں آتے تو ایسا لگتا جیسے نشو آپا کی کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی ہو جس کی تلاش میں وہ کبھی چھت پر جاتیں کبھی ڈیوڑھی پر۔ کبھی کمرے کی کھڑکی کھول کر کھڑی ہو جاتیں جہاں سے کھلیان کا منظر اچھی طرح دکھائی دیتا جہاں ننھے ماموں کبھی کبھی شوقیہ چلے جایا کرتے تھے۔ اور جب ننھے ماموں پر نظر پڑ جاتی

توان کا چہرہ گلاب کی طرح کھل جاتا۔

پھر اچانک گانو کی فضا مسموم ہوگئی۔ طرح طرح کی خبریں آنے لگیں۔ ہر کوئی خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ پورے گانو پر نحوست برس رہی تھی۔ لوگ سرشام ہی گھروں میں دبک جاتے۔ جب رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی کتے کے رونے کی آواز آتی تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ نانی امّاں کہتیں جب کوئی بلا آنے والی ہوتی ہے تو جانوروں کو پہلے سے آگاہی ہوجاتی ہے۔ دھیرے دھیرے گھر کے گھر خالی ہونے لگے۔ یہ ایک ایسا طوفان تھا جس نے سب کے قدم اُکھاڑ دیئے تھے۔ ایک دن خبر ملی کہ ننھے ماموں اپنے والدین کے ساتھ خاموشی سے کہیں کوچ کر گئے۔ اس خبر سے نشو آپا پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ وہ بولائی بولائی کبھی اس دروازے پر کھڑی ہوتیں کبھی اُس دروازے پر۔ انھیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ بھی اس قدر بے وفا ہوسکتے ہیں۔ پھر جب حالات معمول پر آگئے تو نشو آپا کی فیملی بھی مشرقی پاکستان سدھار گئی۔ کچھ دنوں بعد میں بھی اپنے والدین کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ وہاں جب میں پہلی بار نشو آپا سے ملی تو وہ بہت ہی افسردہ تھیں۔ کہنے لگیں۔

"بانو! میرا تو اس اجنبی شہر انجانے ماحول اور نامانوس فضا میں دم گھٹتا ہے۔ مجھے تو اپنی وہی تنگ وتاریک گلیاں یاد آتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے صحن کے پیڑ پودے مجھے آواز دے رہے ہیں۔ درختوں میں لگے پھل پھول مجھے بلا رہے ہیں۔ وہ چوبی تخت میرا انتظار کررہا ہے۔ جب میں اپنی دہلیز پار کررہی تھی تو میرے سینے میں ایک درد سا اُٹھا تھا۔ میں پلٹ پلٹ کر ان پیڑ پودوں، کھیت کھلیانوں اور ندی نالوں کو دیکھ رہی تھی جو پیچھے چھوٹتے جارہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میری ساری متاعِ حیات یہیں چھوٹ گئی ہے۔ صرف ان کی یادیں میرے شامل ہیں۔ برا ہو اُن ظالموں کا جنھوں نے ہمیں گھر سے بے گھر کیا۔ وطن سے بے وطن کیا۔ ہماری بادشاہت چھنی۔ ہمارے تخت وتاج چھینے۔ اب ہماری پہچان بھی چھن گئی۔ ہم بھگوڑے اور مہاجر کے سوا اب کچھ بھی نہیں رہ گئے ہیں۔

وہ بہت ہی خاموش طبع تھیں لیکن جب بولنے پر آتیں تو نہ جانے کب کب کی داستان سنانے بیٹھ جاتیں۔ ہر وقت حزینہ شعر گنگناتی رہتیں۔ نہ جانے اتنے شعر انھوں نے کہاں سے یاد کر لیے تھے۔ پھر ایک دن خبر ملی کہ ان کی شادی طے ہوگئی ہے اور بس ایک ہفتہ کے اندر انجام پانے والی ہے۔ اس خبر سے ہم لوگ بہت خوش تھے اور شادی کی تیاریوں میں لگ گئے تھے کہ اچانک ایک صبح انھوں نے خون کی اُلٹی کی اور اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ والدین پر جو بیتی سو بیتی مجھے بھی بہت ہی شفیق اور بے لوث محبت کرنیوالی نشو آپا کی بے وقت موت کا گہرا صدمہ ہوا۔ وہ چند مصرعے مجھے آج بھی یاد ہیں جنھیں وہ ہر وقت گنگناتی رہتی تھیں۔

کیا خبر تھی کہ زر وسیم کے بازاروں میں — اتنی ارزاں میرے احساس کی قیمت ہوگی
عالمِ عیش و مسرت کے شبستانوں میں — مفلسی باعث توہین محبت ہوگی

شاید ان کی ناشاد و نامراد زندگی کا راز انھیں مصرعوں میں پنہاں تھا۔

آج اتنے برسوں کے بعد ننھے ماموں سے ایک چھوٹی سی ملاقات نے میرے دل کے زخم ہرے کر دیئے۔ جھوٹی شان اور انا نے دو معصوم زندگیوں کو برباد کر دیا۔

☆☆☆

نمودِ سحر

برسوں سے میں اپنے کیے کی سزا اس کال کوٹھری میں کاٹ رہی تھی۔ بھولی بسری یادوں کی انی جب دل میں چبھتی تو آنکھیں چھلک آتیں۔ ویسے اب میں ان درودیوار سے مانوس ہو چکی تھی۔

ایک دن وارڈن نے مجھے اطلاع دی۔

''اچھی کارکردگی کی وجہ سے تمھاری سزا کم کر دی گئی ہے۔ اب تم جلد ہی رہا ہو جاؤ گی۔''

لیکن اب یہ باتیں، یہ دلاسے میرے لیے کوئی معنیٰ نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ میں تو دعا کرتی تھی کہ یہ سزا کبھی ختم نہ ہو۔ باہر کی دنیا میں میرے لیے مسائل ہی مسائل تھے۔ خوراک، پوشاک، چھت اور تحفظ کے مسئلے کا حل میں کہاں کہاں تلاش کرتی پھرتی۔ کوئی بھی تو نہیں۔ سزا کے دوران کوئی بھی مجھ سے ملنے نہ آیا تھا۔ ایک تو کوئی اپنا تھا ہی نہیں اور جو تھے بھی انھوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ایسے مواقع اور حالات میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہی دستورِ دنیا ہے۔

لیکن ایک دن ایک عجیب بات ہو گئی۔

وارڈن نے آکر بتایا کہ کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں حیران رہ گئی۔ یہ کیا معجزہ ہے۔ اب تک تو کسی کو میری یاد نہیں آئی۔ پھر آج یہ کون مجھ سے ملنے آ گیا؟

جب اس سے ملی تو ذہن پر زور ڈالنے کے بعد بھی چہرہ شناسا نہ لگا۔ پریشانیوں نے میرے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ وہ تقریباً تیس پینتیس سال کا ایک خوبرو جوان تھا۔ اپنے سڈول جسم اور خوبصورت خط و خال کی وجہ سے وہ بہت ہی پروقار اور اِمپریسو لگ رہا تھا۔

''شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میرا نام توقیر احمد ہے۔ میں بھی اُسی کالج میں پڑھتا تھا جس میں آپ پڑھتی تھیں۔''

''اوہ! یاد آ گیا۔ کہئے اتنے دنوں بعد کیسے میری یاد آئی؟''

''چلئے یاد آ تو گئی۔ میں صرف اتنا بتانے آیا ہوں کہ آپ خود کو بے سہارا نہ سمجھئے گا۔ رہائی کے دن میں پھر آؤں گا۔ آپ میرا انتظار کیجیے گا۔''

''اس کرم فرمائی کا شکریہ۔ لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ مجھ پر یہ عنایت کیوں؟''

''تفصیل میں جانے کا نہ موقع ہے نہ محل۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ کی مہربانی ہے۔ اب تک جو کچھ ہوا وہ ایک امتحان تھا۔ یہ دنیا ایک درس گاہ ہے جہاں ہر آنے والا پل ہمیں کوئی نہ کوئی درس دے جاتا ہے۔ امید ہے آپ میری باتوں پر غور کر کے میری پیش کش کو قبول کریں گی۔''

پھر وہ چلا گیا۔ اور گزرے دنوں کا ایک ایک لمحہ میری نظروں کے سامنے کسی فلم کی ریل کی طرح چلتا رہا۔ لیکن میرا دل کسی کی باتوں پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ کاش الفاظ کی صداقت جانچنے والا آلہ میرے پاس ہوتا۔ برسوں پہلے بھی یہی الفاظ کسی نے کہے تھے۔

اب سوائے خدا کے اور میرا کوئی سہارا نہ تھا کیونکہ میرے ماں باپ ایک حادثہ میں چل بسے تھے اور میں اس لق ودق دنیا میں تنہا کھڑی اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی ۔تبھی ایک دور پار کے چچا نے آ کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

کئی مہینوں تک میری سدھ بدھ کھوئی رہی تھی ۔لیکن دھیرے دھیرے پھر زندگی کی طرف لوٹ آئی ۔میری دنیا یک لخت بدل چکی تھی ۔میں آسمان سے زمین پر اُتر آئی تھی ۔شہزادی سے نوکرانی بن گئی تھی ۔

چچی ویسے تو ٹھیک ہی ٹھاک تھیں لیکن انھوں نے گھر کے کل کاموں کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔صبح سے لے کر رات تک میں مشین بن کر رہ گئی تھی ۔ اپنے تھکے ہوئے جسم کے ساتھ جب میں بستر پر آتی تو لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ جاتی ۔نیم خوابیدہ حالت میں مجھے ایسا لگتا کہ دو شفیق ہاتھ میرے چہرے کے گرد ہالہ ڈالے کہہ رہے ہوں ۔

''گھبرانا نہیں بیٹا! ہمت نہ ہارنا ۔وقت سدا یکساں نہیں رہتا ۔ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے ۔''

میں چونک کر اُٹھ جاتی ۔یہ آواز دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہتی ۔میرا جی چاہتا ساری رات یہ آواز سنتی رہوں ۔یہی خوشگوار اور روح افزا خواب دیکھتی رہوں ۔ لیکن اکثر مجھے ایسے خواب بھی آئے جیسے میں ایک چھوٹی سی کمزور اور ناتواں سی چڑیا ہوں جسے کسی شکاری نے پنجرہ میں بند کر دیا ہو اور وہ باہر نکلنے کے لیے چھٹپٹا رہی ہو ۔میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھتی ۔اس خواب کے اثرات گھنٹوں میرے اعصاب پر مسلط رہتے ۔

''یہ شکاری کون ہے؟ اس نے کیوں مجھے پنجرے میں بند کر رکھا ہے؟ میں کب تک اس پنجرے میں رہوں گی؟''

میری آنکھیں چھلک آتیں ۔

''میں کیوں زندہ ہوں؟ کس کے لیے زندہ ہوں؟''

''کوئی کسی کے لیے نہ جیتا ہے اور نہ کسی کے ساتھ مرتا ہے۔ یہ زندگی بڑی پیاری شے ہے۔اس کی بقا کے لیے انسان ہزار جتن کرتا ہے۔تم بھی حالات سے لڑتی رہو۔کبھی نہ کبھی اس رات کی سحر ہوگی۔''

میرے دل نے مجھے سہارا دیا۔

اس گھر میں رہتے ہوئے مجھے دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔اس دوران چچا چچی کو میں نے اپنے مستقبل کے حوالے سے کبھی کوئی بات کرتے نہیں سنا تھا۔ حالانکہ وہ ساری پونجی جو میرے والدین نے میرے لیے پس انداز کی تھی، وہ اِن ڈائرکٹ اُنھی کے قبضے میں آ چکی تھی اور میں انھی کے رحم و کرم پر جی رہی تھی۔

پھر ایک دن اچانک ایک نئی بات ہوگئی۔ ہوا یوں کہ ایک دوپہر چچی وغیرہ آرام کرنے چلی گئیں۔ میں جوٹھا برتن سمیٹ رہی تھی کہ اچانک نہ جانے کدھر سے چچا کے بڑے لڑکے نے آ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں گھبرا گئی اور اس غیر متوقع افتاد سے گھبرا کر جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔لیکن پھر اس نے میرا راستہ روک کر کہا۔

''مجھے تم سے صرف دو باتیں کرنی ہیں۔'' میں رک گئی۔

''کون سی باتیں؟''

''دیکھو شہزادی! شاید تمھیں یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں تمھیں پسند کرنے لگا ہوں بلکہ تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔لیکن یہ نہیں جانتا کہ تمھارے دل میں میرے لیے کتنی جگہ ہے۔اگر تمھارے دل میں تھوڑی سی بھی گنجائش ہو تو مایوس نہ کرنا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھارا ساتھ چاہتا ہوں۔''

''بس یا کچھ اور؟'' اس روز پہلی بار میں نے اس سے اتنی بے تکلفی سے بات کی تھی۔

''نہیں بس آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

اس واقعہ نے میری زندگی کو ایک دوسرا ہی موڑ دے دیا۔ اردگرد پھیلی ہوئی گہری تاریکی میں امید کی ایک ہلکی سی کرن دکھائی دینے لگی۔ مجھے ایک ایسے سہارے کی ضرورت تھی جو صحیح معنوں میں مجھے تحفظ دے۔ میری زندگی کے خلاء کو اپنے پیار سے پُر کردے اور اب یہ خلاء پر ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ جینے کی راہ دکھائی دے رہی تھی۔ اب ہم اکثر بڑے خوشگوار موڈ میں گھنٹوں باتیں کرتے۔ قریب رہنے کی وجہ سے بے تکلفی بڑھتی گئی۔ وہ مجھ سے کھل کر باتیں کرتا۔ میں بھی بے تکلف ہوتی جارہی تھی۔ جب وہ میری طرف والہانہ انداز سے دیکھتا اور مجھے ایک خوشگوار مستقبل کی ضمانت دیتا تو میری آنکھوں کے سامنے قوس قزح کے ساتوں رنگ بکھر جاتے۔ اس آنکھ مچولی میں ایک سال گزر گیا۔ قربتیں بڑھتی گئیں، بڑھتی گئیں یہاں تک کہ اب ہم اپنی دلچسپیوں کا سامان گھر سے باہر بھی ڈھونڈنے لگے۔ کبھی بازار، کبھی ہوٹل، کبھی سینما ہال اور کبھی پارک میں ایک دوسرے کی قربت میں سرشار رہتے۔ میں نظروں کی بھید بھاؤ سے ناواقف تھی اور یہی میری بربادی کا پیش خیمہ تھا جس کی ذمہ دار میں خود تھی۔ اب گھر پر بھی وہ ہر وقت میرے اردگرد منڈلاتا رہتا۔ اس روز بھی اتفاق سے کوئی گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ میرے پاس آکر عجیب عجیب حرکتیں اور الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اعتراض کیا تو اس نے وہ ساری تصویریں دکھائیں جو وہ خفیہ طور پر کھینچتا رہا تھا۔ ان میں کئی تصویریں قابل اعتراض تھیں۔ کبھی میں اپنا سر اس کے زانو پر رکھے ہوئے تھی اور کبھی کاندھے پر۔ کبھی اس کی بانہیں میرے گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں۔ اور کبھی میرے کمر کے گرد لپٹی ہوئی۔

میں چکرا گئی۔ میں کتنی بے خبر اور نادان تھی۔ اس نے تو زندگی بھر مجھے بلیک میل کرنے کا پروگرام بنالیا تھا۔

میں خود کو اس کی گرفت سے چھڑا کر تیزی سے بھاگی۔ وہ میرے پیچھے دوڑا۔ پھر نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ میں نے ایک گلدان اُٹھا کر اس کے سر پر

دے مارا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ زمین پر گر گیا۔ سر سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چیخ سن کر اس کا چھوٹا بھائی دوڑا آیا۔ میں جائے واردات پر رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔ اس نے ہاسپٹل جاتے ہی دم توڑ دیا اور میں حوالات کے پیچھے پہنچ گئی۔

مجھ پر مقدمہ چلا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری طرف سے کس نے وکیل مقرر کیا تھا۔ لیکن چونکہ اس حادثہ کا چشم دید گواہ موجود تھا اور ساری باتیں میرے خلاف جاتی تھیں لہٰذا اس میں کوئی شک شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ مقتول کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوئی ہے۔ لیکن میرے وکیل نے یہ ثابت کر دیا کہ مقتول کو جان سے مارنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا اور نہ تو میری اس سے کوئی دشمنی تھی۔ میں نے تو صرف اپنے بچاؤ میں یہ قدم اُٹھایا تھا جو اس کی موت کا سبب بن گیا۔ لہٰذا میری سزا میں کافی تخفیف کر دی گئی۔ لیکن اب مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ میرے سارے احساس مردہ ہو چکے تھے اور میں ایک زندہ لاش کی طرح اپنی سزا کاٹ کر جب بڑے آہنی کالے پھاٹک سے باہر نکلی تو مجھے دنیا بہت ہی بے کیف اور بے رونق لگی۔ نہ کوئی اپنا تھا نہ کوئی شناسا۔ میری نظریں ادھر اُدھر نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ تبھی میری نظریں توقیر احمد پر پڑیں جو اپنے والدین کے ساتھ میرے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ اس کی ماں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”گھبراؤ نہیں بیٹی! میں ہوں تمھاری ماں، تمھیں بے گھر ہونے نہ دوں گی۔“

اور میری آنکھیں نہ جانے کس جذبے کے تحت بھر آئیں اور مجھے ایسا لگا کہ اب میری تاریک راتوں کی سحر ہو گئی ہے۔

سفر در سفر

آغاز سفر سے چند گھنٹے قبل جب دوست احباب اسے الوداع کہنے آئے تو ان سے گلے ملتے ہوئے اس نے کہا۔

''خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔''

سفر در سفر، ہجرت در ہجرت کا سلسلہ جاری تھا۔ جب اس نے پہلی ہجرت کی تھی تو وہ نو عمر تھا۔ اسے بس صرف اتنا یاد تھا کہ چند لوگوں نے اسے بلوائیوں کے چنگل سے چھڑا کر گاڑی میں بٹھا دیا تھا۔ تب سے اس کا سفر جاری تھا۔ وہ سفر کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ زندگی میں کئی موڑ آئے۔ کئی طوفان، کئی زلزلے آئے۔ ہوا کے تیز و تند جھونکوں نے اسے کبھی ادھر پٹکا کبھی اُدھر۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح بے سمت چکر کاٹتا رہا۔ لیکن تھا بہت ہی سخت جان۔ چراغِ زندگی کی لو ٹمٹماتی رہی۔ دن رات اور رات دن میں تبدیل ہوتے رہے۔ ہفتے مہینے بنے اور مہینے سال، یہاں تک کہ وہ لڑکپن کے حدود کو پار کر گیا۔ لیکن سفر اب بھی جاری تھا۔ تلاش اب بھی جاری تھی۔ اس نے مایوسیوں کے اندھیروں کو کبھی اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا۔ اسے یقین کامل تھا کہ کائنات کی ان لامحدود وسعتوں میں کہیں تو اس کے لیے جگہ ہوگی۔ اس نے صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑا۔ تب خدا

کو بھی اس پر رحم آ گیا۔ وہ اپنے بندوں کو اس کی طاقت سے بڑھ کر نہیں آزماتا۔ سفر تھم گیا۔ منزل مل گئی۔ دنیا پھر سے آباد ہوگئی۔ ارد گرد اس نے اپنی پہچان بنالی۔ اور اس وقت تو وہ بالکل مکمل ہو گیا جب اس کا نام لیوا اس دنیا میں آ گیا۔ بہت کچھ کھو کر اس نے جو کچھ بھی پایا تھا اس سے وہ مطمئن تھا کیونکہ اس کے پاس قناعت کی دولت تھی۔ اس دولت سے جو محروم رہتے ہیں وہ ہمیشہ نا آسودہ رہتے ہیں۔ وہ خوش تھا، بے حد خوش کہ اچانک زندگی میں ایک زبردست طوفان آیا۔ اس کی دنیا تہہ و بالا ہوگئی۔ ناؤ ڈگمگانے لگی۔ لیکن پتوار اس کے ہاتھ میں تھا..... اس کا بیٹا۔ اب وہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ دل کا سرور، آنکھوں کا نور، ہم سفر، ہم راز۔ کوئی مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں جاتا۔ وہ بھی زندہ رہا اور بیٹے کے سہارے آگے بڑھتا رہا۔

جب بیٹا جوانی کی سرحد پر پہنچا تو وہ اس سرحد کو پار کر چکا تھا۔ زندگی بھر کی جدوجہد نے اس کے اعصاب ڈھیلے کر دیئے تھے۔ وہ تھک گیا تھا۔ اب اسے آرام کی ضرورت تھی اور وہ مطمئن تھا۔ اسے اپنے بیٹے پر ناز تھا۔ لیکن اب بیٹا بہت اونچے اونچے خواب دیکھنے لگا تھا۔ تغیرات زمانہ نے ساری روشیں بدل ڈالی تھیں۔ اب ہر انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کے پاس گاڑی ہو، خوبصورت سا بنگلہ ہو۔ رہائشی معیار اونچا ہو۔ جنھیں یہ نعمتیں میسر نہیں ان کی معاشرے میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ پھر یا تو دو نمبر سے پیسہ حاصل کر و یا اوروں کی غلامی کے لیے باہر نکل پڑو۔ وہ بھی اپنے خواب کی تعبیر پانے کے لیے ڈالر کے دیس نکل پڑا اور وہاں اس نے وہ سب کچھ پایا جس کا وہ خواہاں تھا۔ لیکن شاید ابھی اس میں انسانیت باقی تھی۔ اسے ہر وقت باپ کی فکر لگی رہتی۔ وہ کسی صورت سے اپنے پاس بلا لینا چاہتا تھا۔ لیکن باپ کو اس سرزمین سے جدا ہونا گوارا نہ تھا جسے اس نے بہت ساری قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ آگ کا دریا پار کر کے وہاں تک پہنچا تھا۔ وہ بیٹے کو بار بار سمجھاتا کہ ڈالر کے حصار سے باہر نکلو۔ اب بھی وقت ہے۔ تم جہاں اپنے

خیال میں عیش کر رہے ہو وہ درحقیقت ایک بھول بھلیّاں ہے جہاں سے اگر کوئی نکلنا چاہے تب بھی راستہ نہیں ملتا۔ ایک سونے کا پنجرہ ہے جس میں ایک بار مقید ہونے کے بعد راہ فرار نہیں ملتی۔ وہ ایک اوکٹوپس ہے جو ایک بار دامن پکڑ لے تو پھر چھوڑتا نہیں۔ نہ بابا نا! مجھے اس کانٹے دار جھاڑی میں نا گھسیٹو۔

لیکن خدا کو یہی منظور تھا وہ اپنی ساری مخالفتیں بھول گیا اور بیٹے کی محبت کے جال میں پھنس کر وہاں پہنچ گیا۔

وہاں دو چار دنوں تک بیٹے بہو نے خوب خوب آؤ بھگت کی لیکن پھر سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ یہ ان کی مجبوری تھی۔ وہاں کوئی بیکار نہیں بیٹھتا۔ عورت ہو یا مرد بچہ ہو یا جوان..... سب اپنی روزی روٹی کمانے میں جٹے رہتے ہیں۔ کسی کے پاس کسی دوسرے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ کئی کئی دن وہ بیٹے سے بات کرنے کے لیے ترس جاتا۔ وہ دن بھر تنہا پڑا پڑا بور ہو جاتا۔ کبھی اسے ایسا لگتا جیسے پورے شہر میں کرفیو لگا ہوا ہو۔ وہ گھبرا کر سوچتا کہ وہ جگہ تو زیادہ بہتر تھی جہاں کم از کم دوست احباب کی صحبت میں وقت اچھا گزر جایا کرتا تھا۔ وہ یادوں کے تہہ خانے میں پہنچ جاتا جہاں بہت ساری تصویریں گڈمڈ ہو جاتیں۔ بیٹے کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آجاتا جو اسکول سے آتے ہی اس کے سینے سے لگ جاتا اور وہ اس پر پیار کی بوچھار کر دیتا۔ کبھی ٹھنکتا، کبھی روٹھ جاتا، کبھی من جاتا۔ اس کے نخرے اُٹھانے میں جو مزہ آتا اس لذت کو وہ آج بھی نہ بھول سکا تھا۔ دوستوں کا چہرہ بھی تصور میں آجاتا۔ ان کی خوش گپیاں یاد آتیں۔ ان کے خلوص اور پیار یاد آتے۔ ایک دن اس نے بیٹے سے کہا۔

"بیٹا یہ جگہ ہم بوڑھوں کے لیے موافق نہیں ہے۔ اب اس عمر میں تو میں کوئی جاب نہیں کر سکتا۔ دن رات بیکار پڑا پڑا بور ہو جاتا ہوں۔ اس لیے سوچتا ہوں واپس چلا جاؤں۔"

"نہیں ابو! نہیں میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ آپ وہاں رہتے ہیں تو مجھے

ہر وقت فکر لگی رہتی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو اولڈ ایج ہوم میں جگہ مل جائے۔''

اس نے تعجب سے بیٹے کو دیکھا۔ پہلے تو اسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔ پھر جب بات سمجھ میں آئی تو آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

''یقین مانئے ابو! آپ کو وہاں تکلیف بالکل نہ ہوگی۔ آپ کو اچھی کمپنی مل جائے گی۔ آپ کا وقت بہت اچھا گزر جائے گا۔ اور ہر ہفتہ میں بھی آپ سے ملنے کے لیے آجایا کروں گا۔''

''ٹھیک ہے میں سوچ کر تمھیں جواب دوں گا۔'' پھر کئی دن اور کئی راتیں وہ مسلسل سوچتا رہا اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسے بیٹے کی بات مان لینی چاہئے۔ اگر وہ واپس چلا گیا تو ہوسکتا ہے اسے بیٹے کے ہاتھوں سے ایک مٹھی مٹی بھی نصیب نہ ہو اور یہ جسد خاکی نہ جانے کس کے ہاتھوں میں پڑ جائے۔ یہاں کم سے کم ہر ہفتہ بیٹے سے ملتا رہوں گا۔ اور مرنے کے بعد میرا بیٹا میرے جنازے کا وارث ہوگا۔ جب اس نے اپنا یہ فیصلہ سنایا تو جلد ہی کاغذات تیار ہو گئے۔

دوسرے دن اسے اولڈ ایج ہوم میں داخل ہونا تھا۔ لیکن اچانک رات میں طبیعت بگڑ گئی۔ شاید اپنی زندگی کے اتنے بڑے المیہ کو برداشت نہ کر سکا۔ صبح ہونے سے قبل ہی آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

(آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ)

احساس کی آواز

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے آواز دے رہا ہو اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے پھر دائیں بائیں دیکھا لیکن کہیں کوئی نہ تھا۔

ایک عرصہ سے وہ اس مکان میں تنہا رہتا تھا۔ تنہائی سے وہ کبھی خائف نہیں ہوا۔ لیکن کچھ دنوں سے آواز نے اسے بیحد خوف زدہ کر دیا تھا۔ کبھی کبھی گھبرا کر وہ دروازے سے اس باہر دیکھتا لیکن دور دور تک کسی ذی روح کا پتہ نہ ہوتا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہوتی۔ کبھی رات کے وقت سوتے میں یہ آواز اس کے کانوں میں آتی۔

''کدھر جا رہا ہے؟ اب بھی سنبھل جا۔''

وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ اپنے ارد گرد نظریں دوڑاتا لیکن کہیں کوئی پر چھائیں تک نظر نہ آتی۔ وہ سوچتا، شاید یہ اس کے احساس کی آواز ہے جسے اس نے بہت پہلے دبا دیا تھا۔ تو پھر یہ؟ اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''میں تمھارا ضمیر ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اب بھی سنبھل جاؤ کیونکہ یہ دنیا چند روزہ ہے۔''

''میں نے تو تمھیں ختم کر دیا تھا پھر تم کیسے زندہ ہو گئے؟''

''کبھی بہت جلد اور بڑی آسانی سے میری موت واقع ہو جاتی ہے اور کبھی مجھ میں زندگی کی تھوڑی سی رمق باقی رہ جاتی ہے۔ یہ مارنے والے کی نیت پر منحصر ہے۔ تم نے تو اپنی دانست میں مجھے اسی وقت مار دیا تھا جب تمھارا باپ دوا اور غذا کے بغیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تھا۔ حالانکہ اب بھی اس کے اکاؤنٹ میں بچی کھچی کچھ رقم پڑی تھی جسے تم گاہے بہ گاہے علاج کے نام پر نکال کر دوستوں کے ساتھ عیاشی میں اُڑا دیا کرتے تھے۔ ان کی موت کے بعد دکھاوے کے لیے اور دنیا کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لیے تم نے بڑی شان سے ان کا جنازہ نکالا۔ نذر و نیاز، غریب فقیر اور اپنوں پرایوں کو خوب کھلایا پلایا۔''

''تم مجھے یہ سب کیوں یاد دلا رہے ہو؟ میں ان باتوں کو بھول جانا چاہتا ہوں۔''

''اور میں یہی تو نہیں چاہتا کیونکہ جس روز تم ان باتوں کو بھول جاؤ گے اسی روز میری موت ہو جائے گی۔''

پھر وہ آواز رازدارانہ انداز میں کہنے لگی۔

''وہ واقعہ تو تمھیں اچھی طرح یاد ہو گا جب ایک ڈاکٹر کے کیبن کے سامنے مریضوں کی لمبی لائن لگی تھی۔ ایک عورت کی حالت بہت ہی نازک تھی۔ اسے فوراً ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ ایک دس بارہ سال کی بچی اسے سہارا دیئے ہوئے تھی اور بہت ہی بے چینی سے اپنا نمبر آنے کا انتظار کر رہی تھی لیکن تم نے کمپاؤنڈر کے ساتھ ساز باز کر کے اس کا نمبر بہت پیچھے کروا دیا۔ کسی پیسے والے نے تمھاری مٹھی گرم کر دی تھی جس کا تھوڑا حصہ تم نے اس کمپاؤنڈر کی جیب میں ڈال دیا تھا اور جب اس عورت کا نمبر آیا تو اس وقت تک وہ مر چکی تھی۔ اس بچی کی فلک شگاف چیخ، دھاڑیں مارنے، تڑپنے اور رونے کا منظر آج تک میں نہیں بھول سکا ہوں۔ اور شاید تم بھی متاثر ہوئے تھے کیونکہ کئی

دنوں تک لڑکی کے رونے چیخنے کی آوازیں تمھارے کانوں میں گونجتی رہی تھیں۔ اور تم بیکل بیکل سے ہو رہے تھے۔ تب مجھے بہت خوشی ہوئی تھی اور اطمینان بھی کہ واقعی ابھی میں مرا نہیں ہوں۔ ابھی مجھ میں زندگی کی حرارت باقی ہے۔ اور وہ دن تو تمھیں ضرور یاد ہوگا جب ایک لڑکی کی گھر سے نقدی اور زیور لے کر فرار ہونے میں تم نے مدد کی تھی اور اپنا ڈبل کمیشن وصول کیا تھا۔ اور یاد کرو تم نے جھوٹی گواہی دے کر ایک بے گناہ کو پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا تھا۔ تمھارا کوئی مستقل پیشہ نہیں رہا پھر بھی زندگی ہر شعبہ میں تمھارا عمل دخل ہے۔ تم بڑے چالاک اور موقعہ پرست ہو۔ ہر جگہ اپنی راہ ہموار کر لیتے ہو۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمھیں اس کی پشت پناہی حاصل ہے جس نے بہت بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اور وہ اب بھی چین سے نہیں بیٹھا ہے۔ اسی کی مدد سے تم لوگ دنیا میں فساد برپا کرتے ہو۔ خون کی ندیاں بہاتے ہو، غریبوں کا خون چوستے ہو، بے گناہوں پر ظلم ڈھاتے ہو، یتیموں کا حق مارتے ہو اور اسی طرح کے بہت سارے غیر اخلاقی کام اس کی نیابت میں کرتے ہو۔ وہ بہت ہی شاطر ہے۔ اس کے فریب سے بچو ورنہ وہ تمھیں برباد کر دے گا۔ یہی نہیں وہ تمھیں جہنم تک گھسیٹ کر لے جائے گا۔''

کچھ وقفہ کے بعد اس نے پوچھا۔

''اب کیا سوچ رہے ہو؟''

'' میں یہ سوچ رہا ہوں تمھیں مارنے کے لیے اب کون سا ہتھیار استعمال کیا جائے۔''

''خیر تمھیں جو کرنا ہو کر لینا مگر مجھے ایک بات اور کہہ لینے دو۔ خدا کے لیے اس حسین اور معصوم لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو جس کے باپ کی دولت پر تمھاری نظر ٹکی ہے۔ تم اس غریب کو سبز باغ دکھا کر خوب بے وقوف بنا رہے ہو۔ اسے بس میں کرنے کے لیے اس

کی آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں ہو، تا کہ زندگی بھر اسے بلیک میل کرتے رہو۔ چھی! یہ انسانیت اور اور تہذیب سے گری کتنی نازیبا حرکت ہے۔ اگر تم اس کے لیے مخلص ہو تو جائز طریقے سے اسے اپنا لو۔ لیکن تم ایسا نہیں کرو گے۔ یہ میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ تمھیں غلط کام کرنے اور غلط طریقے سے پیٹ بھرنے کی عادت پڑ چکی ہے جس نے تمھاری روح کو بے حس اور قلب کو سیاہ کر دیا ہے۔ انسان کا اپنا نفس ہی خود اس کا دشمن ہے جس قدر تم اس کا پیٹ بھرتے رہو گے۔ اسی قدر وہ تمھیں غلط راستے پر لے جائے گا۔ اس لیے نفس کے غلام نہ بنو۔"

وہ اُٹھا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ کئی دنوں تک الجھا الجھا سا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کے حق میں فیصلہ دے۔ اپنی اس خالہ زاد کے حق میں جو بچپن سے اس سے منسوب تھی اور ابھی تک اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے۔ غم زدہ ماں باپ اس سے مایوس ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اور وہ تن تنہا رہ گئی تھی۔ اب ایک وہی اس کا واحد سہارا تھا۔ یا اس امیر کبیر لڑکی کی جانب مائل ہو جس کے پر سونے چاندی کے تھے۔ جس کے سہارے وہ بہت بلندی پر پرواز کر سکتا تھا۔ اس کے حسین اور خوش کن تصور سے ہی اس کے پورے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی لیکن ایک بار پھر اس کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

"اتنی جلد تم اپنی خالہ کی شفقتوں اور محبتوں کو فراموش کر گئے جس نے سگی ماں کی طرح تمھاری پرورش کی جب کہ تم اس نعمت سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ دن رات تمھاری خالی جھولی میں ممتا اور پیار نچھاور کرتی رہی۔ زمانے کے سرد و گرم سے تمھیں بچاتی رہی۔ اور وہ واقعہ تو ناقابل فراموش ہے جب تم موت و زیست کے دوراہے پر کھڑے تھے۔ تمھیں فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس نازک موقع پر تمھاری خالہ نے (جو خود کوئی امیر خاتون نہ تھیں) بڑی مشکل سے پیٹ کاٹ کر اپنی بیٹی

بیاہنے کے لیے تھوڑی سی رقم جمع کی تھی جسے انھوں نے تمھارے علاج پر خرچ کر ڈالا۔ کیونکہ ان کے سامنے تمھاری زندگی زیادہ قیمتی تھی۔''

''یہ کون سی بڑی بات ہے میں بھی اکثر ان کے کام آتا رہا ہوں۔''

''انسان کی یہی تو سب سے بڑی کمزوری ہے کہ اگر وہ کسی کے ساتھ تھوڑی سی بھی مہربانی بھی کرتا ہے تو اسے زندگی بھر یاد رکھتا ہے اور برمحل اس کا ذکر بھی کرتا ہے لیکن دوسروں کی بڑی سے بڑی قربانی کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔''

''جو بھی ہو میں اپنے دروازے پر آنے والی خوش قسمتی کی دستک کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

لیکن جب بھی وہ اس امیر لڑکی کی طرف متوجہ ہوتا تو دو رحم طلب نگاہیں اس کے تصور میں آ جاتیں۔ ان نگاہوں سے پیچھا چھڑانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی کہ اس پر آشوب زمانے میں کوئی بھی اس غریب اور بے سہارا لڑکی کا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار نہ تھا۔

اور پھر آخر نفس کی سرکشی کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان نگاہوں سے پیچھا چھڑانے کا ایک حل اس کی سمجھ میں آ گیا۔

اپنے پروگرام کے مطابق جب وہ اپنی خالہ زاد کو میٹھی میٹھی باتوں میں الجھا کر بڑے پیار سے زہر کا جام اس کے ہونٹوں سے لگا رہا تھا تو اس کا ضمیر بڑے زور سے اُچھلا اور پیالہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر گیا۔

☆☆☆
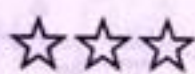
(آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ)

انجام کار

کہتے ہیں کہ زر، زن اور زمین ..... یہ تین چیزیں مصیبتوں کی جڑ ہوتی ہیں۔ یہ اچھے خاصے انسان کو پاگل بنا دیتی ہیں۔ اسے بھی انھی تجربوں سے گزرنا پڑا تھا۔

شبانہ جب اس گھر میں آئی تھی تو ایک سیدھی سادی سی لڑکی تھی۔ وہ نہ تو کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور نہ ہی کسی اونچی سوسائٹی سے۔ اور وہ بھی کون سا زمیندار اور اونچے اسٹیٹس والا تھا۔ البتہ خاندان میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جن کا میعار زندگی اعلیٰ تھا اور فی زمانہ بیشتر لوگ ایسی ہی پرکشش زندگی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ مقابلے کی دوڑ میں ہر کوئی آگے نکل جانا چاہتا ہے۔

شبانہ بھی اسی رنگ میں دھیرے دھیرے رنگتی چلی گئی۔ اعلیٰ رہائش، آسائشی ساز وسامان اور عمدہ پوشاک اس کی کمزوری بنتے گئے۔ بیرون ملک سے آنے والوں کے ٹھاٹ باٹ اس کے شوق کو اور بھی ہوا دینے لگے۔ دل میں خوب سے خوب تر کی طلب اور تڑپ ہلچل مچاتی رہتی۔

لماں کی زیرک اور تجربہ کار نظروں سے اس کے دل میں مچلتی ہوئی تمنائیں پوشیدہ نہ رہ سکیں تو ایک دن انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا۔

''بیٹا! تو بھی باہر جانے کی کوشش کیوں نہیں کرتا؟''

''ہم یہاں کیا بُرے ہیں امّی؟ تر نوالہ نہیں کھاتے لیکن دال روٹی میں تو خوش ہیں۔آپ کیا چاہتی ہیں کہ اس عمر میں میں آپ لوگوں کو بے سہارا چھوڑ کر چلا جاؤں؟ نہیں امّی! میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا۔''

شبانہ نے شوہر کے آخری جملے پر ناگواری سے منہ بنایا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

''ہونہہ! وہ لوگ جو باہر جاتے ہیں جیسے ان کے ماں باپ نہیں ہوتے۔ یہاں تر نوالہ کا تو تصور بھی نہیں۔کبھی کبھی تو دال روٹی کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے کہ آدمی ایک ایک چیز کے لیے ترستا رہے۔''

اس کے دل میں خواہشات کا بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔صبح سے شام تک ہزاروں خواہشوں کو وہ اپنے دل کی قبر میں دفن کرتی رہتی اور رات کو اس قبر پر بیٹھ کر آنسو بہاتی۔

دل میں موجزن یہ خواہشیں کبھی آنکھوں سے جھلکتیں ،کبھی لبوں پر آجاتیں اور پھر اس کے سامنے مسائل کے انبار لگ جاتے۔ وسائل کی کمی کا رونا روتی ،خود پر ترس کھاتی ،دوسروں پر رشک کرتی اور اپنے شوہر کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ ان لوگوں کی زندگی جس طرح گزر رہی ہے وہ خوش کن تو کیا اطمینان بخش بھی نہیں ہے۔

اس کی باتیں سن کر وہ دل مسوس کر رہ جاتا اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔

ایک دن جب وہ آفس سے آیا تو بڑا اکسائٹڈ تھا۔

''شبانہ کہاں ہو بھئی! جلدی تیار ہو جاؤ ابھی ہمیں ایک پارٹی میں چلنا ہے۔''

لیکن شبانہ کے چہرے پر خوشی کی کوئی جھلک نہ اُبھری۔اس کا چہرہ بدستور سپاٹ ہی رہا۔

''آپ چلے جایئے۔ مجھے نہیں جانا۔''

''کیوں؟''

''کہیں جانے کے لائق نہ میرے پاس پوشاک ہے اور نہ زیور۔''

''کیوں؟ اتنے سارے کپڑے جو تمھارے پاس تھے وہ کیا ہوئے؟''

''وہ سب آؤٹ ڈیٹیڈ ہیں۔''

اس کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور دل میں اُٹھنے والی خوشی کی ہلکی سی ہمک پل بھر میں اس طرح دم توڑ گئی جیسے کوئی کمزور سی لہر ساحل سمند پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔

رات کو جب وہ بستر پر لیٹتا تو سوچتے سوچتے اس کا ذہن بری طرح تھک جاتا۔ کبھی وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا کہ شبانہ جیسی خوبصورت اور پیاری لڑکی اس کی ہمسفر بنی تھی لیکن دوسرے ہی پل مایوسی کی دبیز دھند اسے اپنے حصار میں لے لیتی اور وہ یہ سوچ کر افسردہ ہو جاتا کہ اس کے وسائل اتنے محدود ہیں کہ وہ اپنی بیوی کے لیے معمولی خوشیاں بھی فراہم نہیں کر سکتا۔ اب وہ اس سے نظریں چرانے لگا تھا کیونکہ وہ خود کو ایک مجرم سمجھتا تھا۔ اس خلش اور دکھ نے آخر اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اپنے لیے نہ سہی اوروں کے لیے اسے آگے قدم بڑھانا ہی پڑے گا۔ اس نے کئی جگہ اپلائی کیا، انٹرویو دیئے اور آخر کار دبئی کی ایک فرم میں دو سال کا کانٹریکٹ مل گیا۔

وطن چھوڑتے وقت وہ بہت ملول تھا کہ ہزار کمیوں کے باوجود اسے اپنا وطن بہت عزیز تھا۔ اسے اپنی زبان، اپنی گنگا جمنی تہذیب بہت ہی پیاری تھی۔ لیکن دوسری جانب اس لیے خوشی تھی کہ اب معیار زندگی کے بہتر بننے کے لیے یہ ایک مناسب صورت نکل آئے گی۔

اسے دوبئی آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ایک دن شبانہ کے فون سے اسے یہ خبر ملی کہ ابّا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے اور انھیں ہاسپٹلائزڈ کرنا

پڑا ہے تو وہ بے چین ہو گیا۔ بے اختیار اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! اسے پنکھ لگ جائیں اور وہ اُڑ کر گھر پہنچ جائے لیکن وہ اُڑنے سے قاصر تھا کیونکہ موہ مایا کے جال میں پھنس کر اب وہ ایک ایسا پرندہ بن گیا تھا جس کے پر کاٹ کر پرواز کی طاقت چھین لی گئی تھی۔ وہ گھنٹوں کھڑکی کے سامنے کھڑا ان چڑیوں کو دیکھتا رہتا جو پھدک پھدک کر کبھی اس ڈال پر جاتیں کبھی اس ڈال پر۔ کتنی آزاد اور بے فکر تھیں وہ۔ نہ دولت کی ہوس نہ رزق جمع کرنے کی فکر۔ نہ کسی کی ہم سری نہ کسی سے مقابلہ اور نہ جاہ وحشمت کی نمائش کا خیال۔ اسے چڑیوں پر رشک آتا۔

کسی طرح دو سال گزار کر جب وہ وطن آیا تو گھر کی خوشحالی اور گھر والوں کے چہرے پر رونق دیکھ کر اس نے سوچا اس کا یہ دو سال کا بن باس رائگاں نہیں گیا۔ چھٹی کی معیاد پوری ہونے کے بعد جب وہ واپس جانے لگا تو ماں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب کب آ ؤ گے؟''

''اب تو بہت جلد میں فیملی ویزا نکلوا لوں گا۔ پھر جلد ہی انشاء اللہ آپ لوگ میرے ساتھ ہوں گی۔'' ایک موہوم سی امید کے ساتھ اماں دھیرے سے مسکرا دیں۔ دبئ پہنچتے ہی فیملی ویزا کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اور جلد ہی ایک خطیر رقم دے کر ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب ویزا ہاتھ میں آیا تو اماں کا مسکراتا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

اس نے سوچا ایک ساتھ سب کو بلانا تو ممکن نہیں۔ ابھی شبانہ کو بلوا لیتا ہوں۔ پھر اماں ابا کا ویزا نکلواؤں گا۔ شبانہ جب دبئ پہنچی تو اسے ایسا لگا کہ صحرا کے سفر میں اچانک گلستاں آ گیا ہو۔ یہاں جب وہ پہلی بار ایک دعوت میں گئی تو گھر کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پورا ویلا ایر کنڈیشنڈ تھا۔ جگہ جگہ چینی کے گملے میں موسمی پھول بڑے خوشنما لگ رہے

تھے ۔ نادرونایاب ڈیکوریشن پیس، ایرانی قالین، ریشمی پردے، شیشے کے کواڑ جس پر جھلملاتی ہوئی برقی قمقموں کی لڑیوں سے آراستہ ڈرائنگ روم۔ وہ اس طلسم میں کھوگئی جو کبھی بچپن میں دادی اماں راجہ رانی کی کہانیوں میں اسے سنایا کرتی تھیں۔ جب کبھی سیر و تفریح کے لیے جاتی تو ایک سے بڑھ کر ایک عجوبہ اور خوبصورت منظر سامنے ہوتا۔ چوڑی چوڑی صاف وشفاف سڑکیں، عالیشان عمارتیں، شیشے کی طرح چمکیلے شاپ اور مال(Mall) دیکھ کر وہ مبہوت سی رہ جاتی۔ اسے ایسا لگتا جیسے اب تک وہ کسی تہہ خانے میں پڑی تھی۔ اتنی خوبصورت دنیا کا تو اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ اور نہ کبھی خواب میں دیکھا تھا۔

دکانوں میں سجی امپورٹیڈ بیش بہا اشیاء اور جویلری کو وہ ستائشی اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی۔ اس کا جی چاہتا کہ اس کے پرس میں اتنے سارے پیسے ہوں کہ وہ بھی اوروں کی طرح دل کھول کر شاپنگ کرے۔ سڑکوں پر دوڑتی بھاگتی، چمچماتی گاڑیوں پر بیٹھے لوگوں کو رشک سے دیکھتی۔ اس کا جی چاہتا وہ بھی ایسی ہی گاڑیوں پر بیٹھ کر پورے شہر کی سیر کرے۔ مگر اس کے شوہر کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنے ارمان پورے کرسکتی۔ اس کا دل مایوسیوں سے بھرنے لگا۔ دھیرے دھیرے ساری چمک دمک ماند پڑنے لگی۔ اب جب بھی وہ کبھی تفریح کے لیے یا کسی دعوت میں جاتی تو دل پر ایک بھاری بوجھ لے کر آتی۔ اوروں کے گھر سے اپنے گھر کا موازنہ کرتی تو احساس کمتری میں ڈوب جاتی۔ دل اندر سے بجھ جاتا۔

اور ایک دن جب اس نے ایک برتھ ڈے پارٹی میں جانے سے انکار کر دیا تو اس کے شوہر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اب کیا ہوا؟ تم تو ہر پارٹی میں بڑے شوق سے جایا کرتی تھیں۔ بلکہ خبر سنتے ہی تیاریاں شروع کر دیتی تھیں۔"

''اب مجھے یہ سب اچھے نہیں لگتا۔ دوستی برابر والوں سے ہی **جچتی** ہے۔''

''یہ تمھارا کمپلکس آخر کب تمھارا پیچھا چھوڑے گا؟''

اس کی زندگی پھر اجیرن بن گئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر بہت ہی ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے کون سا قدم اٹھایا جائے۔

وہ جس کمپنی میں کام کرتا تھا وہاں اضافی آمدنی کے بہت مواقع تھے جس سے وہ ہمیشہ بچتا رہا تھا۔ اس نے بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ انسان دو چیزوں سے مات کھا جاتا ہے۔ ایک اولاد کی محبت اور دوسرے بیوی کے نخروں سے۔ تو وہ بھی مات کھا گیا۔

اور پھر وہ دھیرے دھیرے اس راستے پر چل نکلا جس پر قدم رکھنے سے پہلے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر نفس کا غلام بننا پڑتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساری چیزیں مہیا ہو گئیں جو نفس کی آسودگی اور دوسروں پر رعب ڈالنے کے لیے کافی تھیں۔

جب شبانہ وہ پہلی بار اپنی ایر کنڈیشن امپورٹیڈ کار میں بیٹھی تو فخر سے اس کا سینہ پھول رہا تھا۔ موافق ہوا نے شوق کی چنگاری اور بھڑکا دی تھی۔

ایک دن وہ بڑی لگاوٹ سے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تو اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ کہنا ہے کیا؟''

''ہاں مسز آصف بتا رہی تھیں کہ جویلری شاپ میں سیل (Sale) لگا ہے۔''

''تو؟''

''تو چل کر دیکھا جائے۔''

اس نے سوچا شبانہ کی برتھ ڈے پر کبھی اس نے کوئی قیمتی تحفہ نہیں دیا ہے۔ اس دفعہ زیور ہی کیوں نہ گفٹ کر دے۔ جو ہار اس نے پسند کیا وہ بہت قیمتی تھا لیکن شبانہ کی خوشی اور مسکراہٹ سے زیادہ قیمتی نہ تھا۔ جب اس نے ہار پہنا تو پھولے نہ سما رہی تھی۔

قد آدم آئینہ کے سامنے زاویہ بدل بدل کر اپنے گلے میں جھلملاتے ہوئے ہیرے کے ہار کو پر شوق نظروں سے تک رہی تھی۔ لیکن اسکی خوشی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔

جرم چاہے سات پردوں میں چھپ کر کیوں نہ کیا جائے۔ ایک نہ ایک دن عیاں ہو ہی جاتا ہے۔ وہ بھی اس عتاب سے بچ نہ سکا۔ اور کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر اس کا دامن تار تار ہو گیا۔ اسے صرف کمپنی نہیں بلک دبئی بھی چھوڑ دینا پڑا۔

وہ کئی سال پہلے جہاں تھا آج ایک بار پھر اپنی زخمی اور آلودہ روح کے ساتھ اسی مقام پر کھڑا تھا اور شبانہ کو اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔

☆☆☆

بھروپیا

''کا سماچار ہے ماسٹر جی ! کہاں بم پھٹا کہاں آگ لگی ۔ کتنے مرے کتنے گھائل ہوئے؟'' اپنے ڈیوڑھی پر بیٹھا بھولے روز ماسٹر جی سے یہی سوال کرتا۔

''ای سسری مہنگائی او بے روجگاری کمر توڑ دیئے ہے۔''

بھولے روز روز کی ہڑتال اور بے روزگاری سے بیزار تھا۔ جب اسے کام ملنے کی اُمید بندھتی تب ہی بند کا اعلان ہوتا۔

''آتنک وادی مندر میں گھس آئے..... بھارت بند۔''

''کسی بڑے لیڈر کا اپہرن ہو گیا..... بھارت بند۔''

''سڑکوں کا ٹیکس بڑھ گیا..... چکّا جام۔''

بھولے کی طرح ہزاروں مزدور اس صورتحال سے پریشان تھے۔

''آپ لوگن پڑھے لکھے ہو ماسٹر جی ! کچھ تو کرو۔ ای بھرشٹا چار کو روکو۔ کوئی آواج اٹھاؤ۔'' بھولے بیچارہ معصوم دیہاتی کیا جانے کہ طاقت ور آواز کے نیچے دب کر کمزور آواز دم توڑ دیتی ہے۔

ایک روز اسکول سے واپس آتے ہوئے بھولے نے ماسٹر جی کا راستہ روک کر

سینے پر ہاتھ رکھ کر بلبلاتے ہوئے کہا۔

''ماسٹر جی آج تو گجب ہو گیا۔اس کی بسورتی صورت دیکھ کر ماسٹر جی نے پوچھا۔

''کیا ہوا بھائی؟''

''اُو آج ہم کام پر جاتے رہے تو گنڈے لوگن نے ہم کو مارا پیٹا اُو ہمری سائکل چھین لیا۔''

''تو اپنے بچاؤ میں تم نے کچھ نہیں کیا؟''

''تھانہ میں رپٹ لکھوائے آئے ہیں۔''

''رپورٹ لکھوانے سے کچھ نہیں ہوتا ہے بھائی۔ تھانہ پولس کچھ نہیں کرے گی۔دس بار تمھیں دوڑائے گی۔اوپر سے پیسہ بھی جھینٹے گی۔''

''پھر ہم کا کریں؟''

''خود میں ہمت پیدا کرو۔لڑو اور اپنی چیز کی حفاظت کرو۔''

''کا چھاجت کریں ماسٹر جی۔لوگ تو گھر ہوں سے بے کسور کو پکڑ کر لے جاوت ہیں۔''

''دیکھو اس بار اپنے گانو کا مکھیا الکشن میں کھڑا ہو رہا ہے۔شاید کچھ سدھار کرے۔گانو والوں کا کچھ بھلا ہو جائے۔'' ماسٹر جی اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

الیکشن قریب آرہا تھا۔بھاشن کا زور بڑھ گیا تھا۔ایک بڑی سبھا کا آیوجن کیا گیا تھا۔کئی گانو کے لوگ جمع ہوئے تھے۔مکھیا نے بھاشن کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''بھائیو اور بہنو! ہمارا گانو ایک پچھڑا ہوا گانو ہے۔ہمیں اس میں سدھار لانا ہے۔سب سے پہلے ہمیں سڑک کی طرف دھیان دینا ہے۔اس کی مرمت کرانی ہے تاکہ باہر سے ہمارا سمپرک بنا رہے۔ جگہ جگہ ہینڈ پمپ لگانا ضروری ہے تاکہ گانو واسیوں کو جو پینے کے پانی کی سمسیا ہے وہ دور ہو جائے۔گانو میں ایک اچھے اسکول

اور ہاسپٹیل کا ہونا ضروری ہے کہ ہمارے بچے مورکھ نہ رہ جائیں اور بیمار پڑنے پر گانو واسیوں کو علاج کی پوری سویدھا مل سکے اور اس کے لیے مجھے آپ کا سہیوگ چاہئے۔ اس گانو پر جتنا ہمارا حق ہے اتنا ہی آپ کا بھی ہے۔ ہمیں بھید بھاؤ ذات پات سے اوپر اُٹھ، کر ایک جُٹ ہو کر کام میں لگ جانا ہے تبھی ہم اپنے دیش کو اُنتی کی اور لے جانے میں سپھل ہو سکتے ہیں۔''

مکھیا کی تقریر نے گانو واسیوں کے دل میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ نے اس کی باتوں سے متفق ہونے کا اعلان کیا۔ دیر تک یہ بھاشن چلتا رہا۔ تالیاں بجتی رہیں۔ دوسرے دن سویرے سویرے یہ افواہ پورے گانو میں پھیل گئی کہ مندر سے بھگوان جی کا اپہرن ہو گیا۔ پورے گانو میں کھلبلی مچ گئی۔

''بڑی آشچرج جنک بات تھی۔ بھگوان جو ہر کسی کی رکھچا کرتے ہیں انھیں غائب کرنے کی کس نے ہمت کی۔ ہو نہ ہو یہ کسی ناستک کا کام ہے۔ یا ہو سکتا ہے وہ خود ہی لپت ہو گئے ہوں۔'' کچھ بھی ہو ماحول گرم ہو چکا تھا۔

لوگ سڑک پر چلتے ہوئے ادھر ادھر ہو رہے تھے کیونکہ سامنے سے ایک بڑا جلوس آ رہا تھا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے جو بہت ہی جوش خروش سے نعرے لگا رہے تھے۔

''دیش کی رکھشا کرو۔ دھاندلی چھوڑ دو۔ گنڈا گردی بند کرو...... بند کرو..... بند کرو۔''

اچانک نہ جانے کیسے دو گروپ میں جھگڑا شروع ہو گیا۔

ہر طرف وحشت اور خوف کے بادل منڈلا رہے تھے۔ لوگوں کے چہرے پر مایوسیوں کی برف جمی ہوئی تھی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں محبوس ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن وہ جو اقتدار حاصل کرنے کے نشہ میں چور تھے، انسانی ذہنوں میں تعصب کا بیج بو کر

اندر ہی اندر اپنی کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔

لڑائی ہاتھا پائی سے شروع ہو کر گولا بارود پر ختم ہوئی۔ پولس آئی مگر اس سے قبل بہت سارا خون بہہ چکا تھا۔ کیونکہ انسانی خون کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ دوسری ساری چیزوں سے زیادہ ارزاں ہو چکا ہے۔ پھر گلی کوچوں میں جلی کٹی لاشیں سسکتی رہیں، تڑپتی رہیں۔ کئی دنوں تک یہ کھیل جاری رہا۔ سبھی حواس باختہ اور خوف زدہ تھے۔ مندر کے سامنے بھیڑ لگی تھی۔ بھگوان جی ہلدی سے لپے پتے اپنے آسن پر براج مان تھے۔ پنڈت پروہت کا کہنا تھا کہ بھگوان جی بیاہ رچانے گئے تھے۔ اور جیسے آگ سرد ہو گئی۔ بربریت کا زور تھم گیا۔ حالات قابو میں آ گئے۔ لیکن اب بھی لوگوں کی آنکھوں میں خوف چہرے پر وحشت اور بے سکونی چھائی تھی۔ ایسے میں مکھیا مسیحا بن کر سامنے آیا۔ اس نے لوگوں کے زخمی دلوں پر پھاہا رکھا۔ ہمدردی جتائی۔ پیسوں سے مدد کی۔ سب کے مرجھائے ہوئے چہروں پر سکون در آیا۔ مرنے والوں کا سوگ کب تک منایا جاتا کہ جانے والے تو لوٹ کر واپس نہیں آ سکتے۔ الکشن ہوا۔ مکھیا نے پیسہ پانی کی طرح بہا دیا۔ آخر اس کی فراغ دلی کام آ ہی گئی۔ کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ مکھیا اب ودھائک بن چکا تھا۔ گانو واسیوں کو اس کے درشن دُرلبھ ہو گئے تھے۔

گانو اور گانو والوں کے حالات بدستور ویسے ہی تھے۔ سڑک اپنی خستہ حالی پر رو رہی تھی۔ بچے گلی کوچوں میں کھیلتے اور لڑتے جھگڑتے نظر آ رہے تھے۔ غریب بغیر دوا دارو کے مر رہے تھے۔ بھولے کا بچہ سخت بیمار تھا۔ وہ مدد کے لیے ودھائک جی کی حویلی پہنچا۔ اتفاق سے وہ حویلی کی بیٹھک ہی پر موجود تھا۔ بھولے اس کے قدموں پر گر گیا۔

”مائی باپ! ہمرا بچہ بہت بیمار ہے اُو کے بچنے کا کوئی امید نا ہے۔ ہمری مدد کرو۔“

”بھولے! تو تو جانتا ہے کہ یہاں سب ہی ضرورت مند ہیں۔ کس کس کی مدد کی جائے۔ تو ایسا کر کہ اپنا کوئی سامان بیچ دے۔“

''ہمرے پاس کا سامان ہے مالک۔''

''تیرے کتنے بچے ہیں؟''

''بھگوان کی کرپا سے مالک تین بیٹا اور پانچ بیٹی ہے۔''

''تو پھر کاہے چنتا کرتا ہے۔ اگر ایک بچہ مر بھی گیا تو تجھے کیا فرق پڑتا ہے۔''

بھولے ہکا بکا منہ دیکھتا رہ گیا۔

''تو ای بھاسن ای جلوس یہ سب کا تھا۔''

معاً اس کی نظروں میں مکھیا کا چہرا ایک بہروپیے کے چہرے میں بدل گیا۔ جس کی نہ کوئی ذات ہے نہ دھرم۔

☆☆☆

اَندھ وشواس

مجھے اس کالونی میں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اس لیے آس پاس والوں سے ابھی تک راہ ورسم استوار نہیں ہوئی تھی۔ وقت گزاری کے لیے میں سارا دن پڑا اخبار پڑھتا رہتا یا کسی رسالے کا مطالعہ کرتا رہتا۔ کبھی کبھی میری نظریں سامنے والے فلیٹ کی طرف اُٹھ جاتیں کیونکہ ادھر ہونے والا شوروغل مجھے اس طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ شروع شروع میں یہ شور شرابا مجھ کو بہت گراں گزرتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ بچوں کی چیخ پکار سے میں سوتے میں چونک کر اُٹھ جاتا۔ عجیب مصیبت تھی..... سوچتا یہ میں کہاں آ پھنسا۔ دل چاہتا اسی وقت گھر چھوڑ دوں۔ لیکن دوسرا مکان تلاش کرنا آسان نہ تھا۔ اور اس وقت میری جھلاہٹ انتہا کو پہنچ جاتی جب صبح صبح میں میٹھی نیند کے مزے لے رہا ہوتا تبھی سامنے کے فلیٹ سے آتی ہوئی پاٹھ اور شنکھ کی آوازیں میرے خوشگوار خواب کے سارے مزے کرکرے کر دیتیں۔ نیند اُچٹ جاتی تو میں بالکونی میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ سامنے لڈو اور پھلوں سے بھری تھالی رکھی ہوتی۔ ایک تلک دھاری پنڈت زور زور سے اشلوک پڑھ رہا ہوتا اور اصلی گھی کی اشتہا انگیز خوشبو پوری فضا میں پھیلی ہوتی۔ اس فلیٹ میں تقریباً ایک درجن سے زیادہ افراد رہتے تھے۔ لڑکے لڑکیوں سے گھر بھرا پڑا تھا۔

لڑکیاں ساری بڑی تھیں جن میں بعض جوانی کی حدود میں داخل ہو چکی تھیں۔ بعض ان حدود کو چھو رہی تھیں۔ انھی میں ایک لڑکی کا نام لیلی تھا۔ غالباً یہ لَو لی کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ وہ اپنی سب بہنوں میں بہتر تھی۔ ویسے خوبصورت کہے جانے کی مستحق نہ تھی۔ لیکن اپنے نام کے حساب سے پیاری ضرور تھی۔ اور ہر پیاری شے توجہ طلب ہوتی ہے اس لیے میری نظریں بار بار اس پر جا کر ٹک جاتیں۔ پھر رفتہ رفتہ میں اس ماحول کا عادی ہوتا گیا۔ زندگی اپنے معمول پر آتی گئی۔ میرا آدھا وقت کالج میں گزرتا اور آدھا وقت گھر پر اور چونکہ ابھی نئی نئی تقرری ہوئی تھی تو لیکچر دینے کے لیے مجھے خاصی تیاری کرنی پڑتی تھی۔ میں اسی میں مشغول رہتا۔ شور و غل اور ہنگامہ بدستور ویسا ہی تھا لیکن چونکہ اب میں اس کا عادی ہو چکا تھا۔ لہٰذا میرے شب و روز کے معمول پر یہ زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

ادھر کئی دنوں سے سامنے کے فلیٹ میں بڑی شانتی تھی۔ مجھے اس خاموشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اتفاق سے ایک دن کالج سے آ رہا تھا تو وہیں پنڈت نظر آ گیا۔ میں نے کہا۔

''کہیے پنڈت جی! سب کشل منگل تو ہے نا؟ کئی دنوں سے درشن نہیں دیئے؟''

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔

''آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں اور صبح صبح آپ کا اشلوک سن کر تو میں دھنیہ ہو جاتا ہوں۔ آخر کئی دنوں سے کہاں غائب تھے؟''

''دراصل لڑکی کو تیرتھ استھان لے جایا گیا۔ بڑے بڑے گیانی پنڈت اوجھا سے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا دلوانے کے لیے۔''

''کون لڑکی؟''

''وہی جس پر بھوت آتا ہے۔''

''اوہ! گویا آپ بھوت اُتارنے میں ناکام رہے۔ ویسے آپ کتنے دنوں سے یہ کام کر رہے ہیں؟''

''وہ تو جب سے ہوش سنبھالا ہے تب ہی سے۔ یہ تو میرا خاندانی پیشہ ہے۔''اس نے بڑے فخر سے کہا۔

''ایسے کام نہیں چلے گا پنڈت جی کچھ اور دھیان گیان پراپت کیجیے۔''

پنڈت نے تو اپنی راہ لی اور میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ ہو نہ ہو یہ بھوت والی لڑکی لولی ہی ہے کیونکہ وہ کچھ دنوں سے نظر نہیں آ رہی ہے۔

پھر گرمیوں کی چھٹی میں گھر چلا گیا۔ وہاں تقریباً دو ماہ میرا قیام رہا۔ اس درمیان اکثر لولی کی معصوم صورت میرے ذہن کے پردے پر اُبھر آتی۔ نہ جانے اس بیچاری کا کیا حشر ہوا۔ بھوت پریت پر تو مجھے یقین نہیں لیکن کوئی نہ کوئی افتاد اس پر ضرور آ پڑی ہے۔ چھٹی گزار کر جب میں واپس آیا تو حسب سابق اکثر میں بالکونی میں آ کر کھڑا ہو جاتا اور غیر ارادی طور پر میری نظر اس فلیٹ کی طرف اٹھ جاتی لیکن لولی کہیں نظر نہ آتی۔

ایک رات میں گہری نیند میں سویا ہوا تھا کہ کسی کے رونے کی آواز سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی کسی کو زور زور سے مار رہا ہو کیونکہ رونے کی آواز دردناک چیخ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس طرف سے اپنا دھیان ہٹا کر پھر سے سونے کی کوشش کی لیکن کافی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔

اس دن کے بعد سے تو یہ آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی روز ہی سنائی دینے لگی۔ آواز کی سمت کا اندازہ کر کے میرا دل بے چین ہو جاتا۔ بچپن سے سنتا آیا تھا کہ اکثر جوان لڑکیوں پر بھوت کا سایہ ہو جاتا ہے اور عموماً رات کے وقت جب بھوت اسے اپنے خوفناک پنجوں میں جکڑ لیتا ہے تو وہ رونے لگتی ہے۔ پھر اسے لات اور جوتوں سے مار مار کر بھگانا پڑتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور میں بڑے ہی دکھ سے سوچنے لگتا کہ اکیسویں صدی میں جبکہ دنیا ترقی کی طرف گامزن ہے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی اس مشینی دور میں جہالت کا یہ عالم۔

یہ مُلّا پنڈت کچھ سادہ لوح اور معصوم لوگوں کو جہالت کا پاٹھ پڑا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے انھیں لوٹتے ہیں۔

پھر ایک دن میں نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ کئی پنڈت لڑکی کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ اس کے بال کھول دیئے گئے تھے اور اسے ایک کالا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ وہ لوگ کچھ پڑھ پڑھ کر اس کے کانوں میں پھونک رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ پوچھتے بھی جا رہے تھے۔ لڑکی نہیں کے اشارے میں سر ہلا رہی تھی۔ کرب کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ پھر ان کی آواز تیز ہوتی گئی۔

''بول کیا چاہتا ہے؟ کنیا کو چھوڑے گا کہ نہیں..... کیا بھینٹ لے گا؟'' ایک پنڈت اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایسے نہیں مانے گا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔'' اتنا کہہ کر اس نے نیم کی بڑی سی چھڑی اُٹھائی اور اسے لڑکی کی پیٹھ پر توڑنا شروع کر دیا۔ لڑکی نڈھال ہو کر ایک طرف لڑھک گئی۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ میری نگاہیں جو ایک پل کے لیے بھی ادھر سے ہٹ نہیں رہی تھیں، اس اذیت ناک منظر کی تاب نہ لا کر جھٹ بند ہو گئیں۔ یہ منظر بڑا ہی انوکھا اور دردناک تھا۔

ایک شام میں ادھر سے گزر رہا تھا تو دیکھا کئی آدمی لولی کو پکڑ کر گاڑی میں بٹھا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ ایسا لگا جیسے کوئی خزاں رسیدہ زرد پھول ہو۔ کیا یہ وہی لولی ہے جس کے چہرے پر شفق پھوٹتی تھی؟ اب نہ وہ روپ تھا نہ رنگ۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا جس میں کوئی حلاوت باقی نہ رہی تھی۔ شاید اسے ہاسپٹل لے جا یا رہا تھا۔ انھیں عقل تو آئی تھی لیکن دیر سے۔ اور بالآخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ لولی اندھ وشواس کی بھینٹ چڑھ گئی۔

☆☆☆

بیساکھی

وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی، اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ جس گھر میں وہ پرورش پا رہی تھی اب وہی اس کا گھر تھا اور وہاں کے مالک ہی اس کے ماں باپ تھے لیکن ماں باپ والی کوئی بات ان میں نہ تھی۔ نہ آنکھوں میں پیار و محبت کی جھلک، نہ رویہ میں وہ والہانہ پن۔ مانا کہ وہ اپنے اور بھائی بہنوں کی طرح خوبصورت اور پر کشش نہ تھی۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور۔ اور پھر ماں کے لیے یہ تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مثل مشہور ہے کہ پیٹ کا کال تو بھی لال لیکن وہ کبھی لال نہ بن سکی ہمیشہ کال ہی بنی رہی۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اسے ایک مدرسہ میں ڈال دیا گیا جہاں وہ ایک سال تک ب سے بکری اور خ خصی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ گندے سندے پوشاک والے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے میں اسے اُبکائی آتی۔ وہ چشم تصور سے دیکھتی کہ وہ صاف ستھری یونیفارم میں ملبوس ہے اور ایک نوکر ہاتھ میں بستہ لیے اسے اسکول بس تک چھوڑنے جا رہا ہے۔ اس کا دل مچل جاتا۔ اچھے اسکول میں پڑھنے کی تمنا جاگ اٹھتی۔

ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"امّاں! میں بھی اسی اسکول میں پڑھوں گی جہاں صاف ستھرے بچے پڑھتے

ہیں۔ مدرسہ میں گندے بچوں کے ساتھ پڑھنے میں میرا دل نہیں لگتا۔''

اماں نے قہر برساتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا؟ کہاں کی مہارانی ہو؟ کبھی آئینے میں صورت دیکھی ہے؟؟ زیادہ اونچی اڑان نہ بھرو۔ جہاں ہو وہیں رہو۔'' وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

اس روز پہلی بار اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس کی ماں نہیں ہوسکتیں۔ بھلا ماں بھی کہیں ایسی ہوسکتی ہے۔ ہاں البتہ ابا کے دل میں اس کے لیے تھوڑی سی جگہ تھی۔ وہ اکثر اسے پیار کرتے۔ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ شاید وہی اسے کہیں سے اُٹھا کر لائے ہوں۔ ایسا وہ اکثر سوچتی۔ ایک دن اس نے ابا سے بھی وہی بات دہرائی کہ وہ کسی اچھے اسکول میں پڑھنا چاہتی ہے۔

''ٹھیک ہے، کچھ دنوں بعد کسی اچھے اسکول میں تمھارا داخلہ کروا دیں گے۔''

ابا نے اسے تسلّی دی لیکن یہ صرف طفل تسلّی تھی۔ ایسا ہوا نہیں کیوں کہ اماں کی خواہش اور اجازت کے بغیر گھر کا کوئی کام نہیں ہوسکتا تھا۔ اور ابا بیچارے تو ویسے ہی مجبور تھے۔ کئی سالوں سے انھیں دمّہ کا مرض لاحق تھا۔ ہر وقت پلنگ پر پڑے رہتے۔ چلنا پھرنا دشوار تھا۔ گویا دنیا سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ روز بروز ان کا یہ مرض طول پکڑتا جارہا تھا۔ آخر ایک دن وہ دنیا سے ہی اُٹھ گئے۔ ان کی موت سے وہ بالکل ہی ٹوٹ گئی۔ یہ اس کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ اس شخص نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا جس کے دل میں اس کے لیے کچھ نرم جذبے تھے۔ پڑھنے سے اس کا دل اُچاٹ ہوگیا۔ اس نے مدرسہ جانا چھوڑ دیا لیکن گھر کے کسی فرد کو اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ بہتر ہی تھا کہ وہ جو وقت مدرسہ میں گزارتی تھی وہ اب گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنے میں گزرتا تھا۔ لیکن اس کا ردعمل اس کے ذہن پر بہت ہی منفی پڑا۔ وہ روز بروز چڑچڑی، ضدی، اور باغی ہوتی چلی گئی۔ گھر کی چیزیں برباد کرنے میں اسے مزہ آتا۔ جان بوجھ کر کبھی کپ تو کبھی پلیٹ توڑ دیتی۔ کھانے کی اچھی

چیزوں کو ڈسٹ بن میں ڈال دیتی۔ کبھی سوکھتے ہوئے کپڑوں یا بچھی ہوئی چادروں کو کتر دیتی۔ اور جو کبھی پکڑی جاتی تو تو جھڑکیاں اور پٹائی اس کا مقدر ہوتا۔

جب ذرا بڑی ہوئی تو کھانا پکانے کا کام اس کے سپرد کیا گیا۔ وہ دال سالن چولہے پر چڑھا کر سو جاتی۔ پھر وہ نہیں جانتی کہ سالن کا کیا حشر ہوا لیکن اس کا جو حشر ہوتا اسے وہ کئی دنوں تک بھلا نہیں پاتی۔ ایسی زندگی سے وہ تنگ آ گئی تھی۔ ایک دن ہمت کر کے پھر اس نے کہا۔

''اماں! آپ میرا داخلہ اسکول میں کیوں نہیں کروا دیتی ہیں۔''

اماں نے چونک کر دیکھا۔

''اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ دوسری تیسری کلاس میں پڑھتے کیا اچھی لگو گی؟ گھر کے کام کاج میں دل لگاؤ۔ لڑکیوں کو خانہ داری میں ماہر ہونا زیادہ ضروری ہے۔''

''باجی کے لیے آپ ایسا کیوں نہیں سوچتیں؟ وہ تو گھر کے ایک کام کو بھی ہاتھ نہیں لگاتیں۔'' اماں کے تیور ایک دم بدل گئے۔

''اس لڑکی نے تو میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ مرنے والا مر گیا اور یہ عذاب مجھ پر مُسلط کر گیا۔'' ان کا پارہ ہائی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دیر تک دل کے پھپھولے پھوڑتی رہیں اور اس کے دل میں نفرتوں کا لاوا پکتا رہا۔

کچھ دنوں بعد روحی کی شادی تھی۔ اس موقع پر بہت سارے مہمان آئے تھے۔ اماں ہر ایک سے یہی کہتیں۔

''اب تو مجھے روبی کی بھی بہت فکر ہو رہی ہے۔ اگر آپ لوگوں کو نظر میں کوئی لڑکا ہے تو بتائیے۔''

اور اماں کی منشا بہت جلد پوری ہو گئی۔ ایک رشتہ انھیں پسند آ گیا۔ لڑکے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ پہلی بیوی مر چکی تھی۔ دو بچے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی اسے سکتہ سا لگ

گیا۔ اسے اپنا مستقبل دھند میں ڈوبا ہوا بہت ہی تاریک نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ہمت کر کے کہا۔

''امّاں! مجھ پر یہ ظلم نہ کریں۔ کچھ دن اور پڑھنے کا موقع دیں۔ میں پرائیوٹ سے ہی امتحان دے لوں گی۔''

''یہ سوچنا تمھارا کام نہیں ہے۔ دیکھ رہی ہوں تم بہت خود سر اور بے باک ہوتی جارہی ہو۔ یہ شادی ہو کر رہے گی۔''

انھوں نے حتمی فیصلہ سنایا۔

اس کے اندر جو لاوا پک رہا تھا وہ اب جوالا مکھی کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا اور اس سے قبل کہ وہ پھٹ جائے اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔ اس روز جب سب لوگ خواب غفلت میں پڑے تھے۔ وہ ایک سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر رات کے اندھیرے میں اس گھر کی دہلیز پار کر گئی۔

جب وہ اسٹیشن پہنچی تو پلیٹ فارم پر کوئی گاڑی نہ تھی۔ گاڑی کب آئے گی، کس سمت جائے گی، اسے کچھ علم نہ تھا۔ وہ تو صرف یہ جانتی تھی کہ اسے یہاں سے کہیں دور چلے جانا ہے۔ حالات نے اسے اتنا زود رنج بنا دیا تھا کہ برے بھلے کی تمیز ہی نہ رہی تھی۔ جو قدم اس نے اُٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط..... یہ قدم اسے کس راستے پر لے جائے گا.....اس کی منزل کہاں ہوگی.....؟ ان سب باتوں کی اب اسے پرواہ نہ تھی۔ اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ایک گاڑی پلیٹ فارم پر آکر لگی۔ چند مسافر ایک ڈبہ میں چڑھ رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔ پورے کمپارٹمنٹ میں سکوت طاری تھا۔ کچھ مسافر سوئے ہوئے تھے کچھ اونگھ رہے تھے۔ نئے مسافروں کے آنے سے تھوڑی دیر کے لیے ہل چل ہوئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ نیچے کی برتھ پر ایک خاتون سو رہی تھیں۔ وہ اسی برتھ کے کنارے ٹک گئی۔ چند اسٹیشن آگے جانے کے بعد ٹی ٹی نے آکر اس سے ٹکٹ مانگا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ٹی ٹی

نے اسے خاموش دیکھا تو اس کی آواز بلند ہوگئی۔ وہ اسے جیل بھیج دینے کی دھمکیاں دینے لگا۔ وہ خاتون دیر سے یہ سب سن رہی تھیں۔ انھوں نے سوچا اگر ٹی ٹی اسے اُتار کر لے جائے گا تو رات کے اندھیرے میں نہ جانے اس کا کیا حشر کرے گا۔ انھوں نے ایک جھرجھری لی اور ٹی ٹی سے ریکویسٹ کی کہ وہ اس کا ٹکٹ بنا دے۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی ہیں۔ کسی مجبوری کے تحت یہ ٹکٹ نہ لے سکی ہے۔ ٹی ٹی نے تھوڑی سی پس وپیش کے بعد فائن کے ساتھ ٹکٹ بنا دیا۔ ٹی ٹی کے جانے کے بعد خاتون اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''لڑکی تمھیں کہاں جانا ہے؟

''ابھی میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا ہے؟''

''تو پھر وہیں لوٹ جاؤ جہاں سے آئی ہو۔ گھر والوں کی تھوڑی سی سختیاں دردر بھٹکنے سے بہتر ہے۔''

انھیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی گھر سے لڑ جھگڑ کر فرار ہوئی ہے۔ خاتون کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اسے اس طرح خاموش دیکھ کر انھوں نے پھر اسے مخاطب کیا۔

''میرے ساتھ چلنا پسند کروگی؟'' اس نے فوراً حامی بھر لی کیونکہ ابھی اسے کسی سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ خاتون نے اسے اپنے گھر پناہ دی۔ بہت ساری سہولتیں دیں۔ اس کی ضرورتوں کا خاص خیال رکھا۔ لیکن ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ کچھ ڈسٹرب سی رہتی ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔

''ایسی زندگی تو وہاں بھی گزر رہی تھی۔ گھر سے باہر قدم نکالنے کا خاص مقصد تو تعلیم حاصل کرنا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم گھر پر پڑھائی شروع کردو۔ پھر پرائیوٹ

سے اکزام دے دینا۔'' انھوں رسانیت سے کہا۔

بات مناسب تھی۔ اس نے مان لی اور پڑھائی شروع کردی۔ لیکن نہ جانے اسے کیا کمپلکس تھا کون سا ٹینشن تھا کہ کبھی کبھی وہ بالکل خاموش ہوجاتی۔ اس کی آنکھوں سے بے چینی جھلکتی۔ ایک دن اس نے کوچنگ کلاس جوائن کرنے کی خواہش ظاہر کی جس کی اجازت انھوں نے فوراً دے دی۔ اگر وہ اجازت نہ بھی دیتیں تو وہ وہی کرتی جو اس کا دل چاہتا۔ اتنے دنوں میں انھوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ بیحد خودسر اور ضدی ہے۔ کوچنگ جوائن کرنے کے بعد وہ صبح وشام گھر سے غائب رہتی۔ کبھی نوٹس تیار کرنے کے بہانے کبھی کسی اور بہانے۔ ذرا سا پوچھنے پر بدک جاتی۔ اب اس کے لیے اکثر فون آتے رہتے۔ ان کے پڑوسی اور رشتے دار طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے۔ تب انھیں اس سے خوف آنے لگا۔ نہ جانے یہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟؟ اپنا اتہ پتہ بھی صحیح نہیں بتاتی۔ اس دوران اس نے میٹرک کرلیا اور اب وہ کالج میں داخلہ لینا چاہتی تھی لیکن اب وہ اس سے بہت خائف ہوچکی تھیں۔ کہنے لگیں۔

''دیکھو روبی! روز بروز تمھاری سرگرمیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ تمھارے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے اس وجہ سے میں کافی ڈسٹرب ہوگئی ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنی رہائش کا کہیں اور انتظام کرلو۔''

وہ ششدر رہ گئی۔ اس غیر متوقع بات کی اسے امید نہ تھی لیکن اس نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ وہ عجیب فطرت کی لڑکی تھی۔ کسی سے دبنا، ہار ماننا یا مصالحت کرنا اس کی سرشت بھی تھا ہی نہیں۔ اس نے بہت ہی خاموشی کے ساتھ اپنی رہائش کا بندوبست کہیں اور کرلیا مگر حصول معاش کے لیے اسے بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس سلسلے میں اسے بہت سارے لوگوں سے سابقہ پڑا جن میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی۔ اب وہ قدرے بے باک بھی ہوگئی تھی۔ مردوں ملنا، گھل مل کر باتیں کرنا اور اپنا کام نکالنا اس کے لیے کوئی

بڑی بات نہ تھی۔ لیکن کچھ دنوں بعد وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ مردوں کی بھوکی نگاہیں اس کے جسم کے آر پار ہو رہی ہیں۔ تب اس کے اندر کی شریف لڑکی اسے جھنجھوڑ دیتی۔

''روبی! تو یہ کیا کر رہی ہے؟ یہ جو بے شمار بھیڑے تیرے پیچھے لگے ہیں اور تجھے چیر پھاڑ کر کھانے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں ان سے بچ کر کہاں جائے گی؟؟'' ''اب بھی وقت ہے۔ لوٹ جا! لوٹ جا اب بھی!!''

لیکن کہاں؟ نظریں گھما کر اپنے ارد گرد دیکھتی۔ سب دروازے تو اس نے خود ہی بند کر دیئے تھے۔ اور اب تو اتنی دیر ہو چکی ہے کہ سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ بربادی تو ہر حال میں اس کا مقدر بن چکی ہے۔

''اماں! کاش آپ میرے لیے اپنے دل میں تھوڑا نرم جذبہ رکھتیں..... تھوڑا سا پیار..... تھوڑی سی محبت دیتیں تو آپ کے خزانے میں کوئی کمی نہ آجاتی۔ یہ تو ایسی دولت ہے جو دونوں ہاتھوں سے لٹانے پر بھی ختم نہیں ہوتی ہے۔ حق سمجھ کر نہیں تو خیرات ہی کی طور پر تھوڑی سی محبت میری جھولی میں ڈال دیتیں تو آج مجھے منزل کی تلاش راستوں کی دھول پھانکنی نہ پڑتی۔''

اب تو لوگ اسے شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ اپنے گھروں میں رکھنے سے کتراتے تھے کہ اس کے چاہنے والے عاشق زار صبح و شام چلے آتے ہیں۔ اب وہ تنہائی سے خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ اسے ایک سرپرست ایک محافظ کی ضرورت محسوس ہوتی۔ وہ جو چاہت کا دعویٰ کرتے ہیں سب جھوٹے، فریبی اور دھوکے باز ہیں۔ اس دنیا میں مطلبی اور خود غرضوں کی کمی نہیں۔ لیکن اب اسے انھیں کے بیچ جینا ہے۔ اپنا محافظ آپ بننا ہے۔ اس نے ایک عزم کیا اور اسی عزم کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔

اب وہ بی اے فائنل میں پہنچ گئی تھی۔ جس کالج میں وہ پڑھتی تھی وہاں اعجاز نام کا ایک شخص کلرک کے پوسٹ پر تھا۔ بے چارہ پولیو کا مارا پاؤں سے معذور تھا۔ روبی جب

اسے دیکھتی تو ہمدردی سے اس کا دل بھر جاتا۔ وہ تاسف سے کہتی بیچارہ کتنا ہینڈسم ہے اور خدا نے اسے اپاہج بنا دیا۔ نہ جانے اس کے کون سے کام میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔

موسم سرما میں جب وہ دھوپ سینکنے کے لیے کمپاؤنڈ میں آتا اور روبی کا پیریڈ خالی ہوتا تو وہ اس سے باتیں کرتی۔ کبھی ضرورت پڑنے پر اس کے کچھ مدد کر دیتی۔ بہت ساری خامیوں کے ساتھ اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ کسی مجبور کی مدد کرنے، بوڑھے بیمار کی خدمت کرنے اور بھوکے کو کھانا کھلانے میں وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔ اس کی انھی خوبیوں نے اعجاز کو بہت متاثر کیا۔ جب وہ اس سے باتیں کرتی تو اس کی کلاس فیلوز اس کا مذاق اُڑاتیں۔

''اری سارے کو چھوڑ کر یہ لنگڑا ہی تجھے بھا گیا ہے؟''

''کیوں کسی کی مدد کرنے میں کوئی برائی ہے کیا؟''

''نہیں نہیں برائی کیسی.....جا زندگی بھر اس کی خدمت کرتی رہ۔''

اور شاید وہ قبولیت کا وقت تھا کہ ایک دن اعجاز نے کہا۔

''روبی! مجھے تمھاری جیسی ساتھی کی ضرورت ہے۔ کیا تم میرا سہارا بننا پسند کروگی۔؟''

روبی نے فوراً کوئی جواب نہ دیا، سوچنے کے لیے تھوڑی مہلت مانگی۔

پھر اس موضوع پر کئی دنوں تک سوچتی اور روتی رہی۔ وہ جس کی اُڑان اتنی اونچی تھی.....جس نے کبھی کسی سے ہار مانا، مصالحت کرنا سیکھا ہی نہیں تھا.....آج اس نے تقدیر سے مصالحت کر لی تھی۔

اس نے سوچا شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ اس کی یہی مصلحت تھی اور اس کی قسمت میں کسی کی بیساکھی بننا لکھا تھا۔

دوسرے دن اس نے اعجاز کو اپنی رضامندی دے دی۔

☆☆☆

گرم ھوا

''یہ کیسی دیوار ہے جو میرے بچوں کے بیچ حائل ہے۔ یہ کیسا بٹوارہ ہے جس نے بھائی کو بھائی سے اور ماں کو بیٹے سے جدا کر دیا ہے۔''

برسہا برس نے گزر جانے کے بعد بھی دادی اماں اس کرب سے چھٹکارا نہیں پاسکی تھیں۔ بٹوارے کے بعد جب منجھلے اور چھوٹے چچا نے یہاں سے جانے کا قصد کیا تو دادی اماں کو بھی ساتھ چلنے کے لیے زور دیا لیکن وہ کسی قیمت پر بھی جانے کے لیے رضامند نہ ہوئیں۔ کہنے لگیں۔

''یہی ہمارا آبائی وطن ہے۔ یہیں ہماری جڑیں ہیں۔ اس سرزمین پر سالہا سال ہمارے بزرگوں نے راج کیا ہے۔ یہاں ہماری عظمتوں کی نشانیاں ہیں۔ یہاں کے ذرے ذرے سے مجھے پیار ہے۔ ان ہواؤں، ان فضاؤں میں میرے اپنوں کی خوشبو رچی بسی ہے۔ یہاں کے در و دیوار سے ہماری بہت ساری خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ اس جنت نشاں وطن کو چھوڑنا کیا وطن سے غداری نہیں؟ جو وطن کو چھوڑ جاتے ہیں انھیں خدا کی ذات پر یقین نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں دوسری جگہ انھیں سکون ملے گا، تحفظ ملے گا اور عزت و توقیر ملے گی۔ وہ یہ نہیں سوچتے جو ہماری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے

وہ تو ہو کر ہی رہنا ہے۔ چاہے ہم دنیا کے کسی حصّے میں بھی چلے جائیں۔ نا بابا نا! بے نام ونشاں بن کر مجھے در در کی ٹھوکریں نہیں کھانی۔"

یہ ان کا حتمی فیصلہ تھا۔ ان کے ارادے میں ایک عزم، ایک استقلال تھا۔ ابّا کو بھی دادی امّاں کے خیالات سے اتفاق تھا۔ وہ کہتے۔

"جہاں پیدا ہوئے ہیں وہیں جینا، وہیں مرنا ہے۔"

وہ حیران تھے۔

"یہ کیسی گرم ہوا چلی جس نے جڑ ہی اُکھاڑ دی۔ ایک بھگڈر سی مچی ہے۔ جیسے انسان انسان نہ رہ کر بھیڑ بکری بن چکا ہے۔" دادی امّاں نے کہا۔

"بھیڑ بکری بھی اپنے کھونٹے پر شیر بن کر رہتے ہیں۔"

"اور اگر کھونٹا ہی کمزور ہو جائے؟"

چھوٹے چچا کب خاموش رہنے والے تھے۔

"تو اسے مضبوط کرنا ہے نہ کہ اُکھاڑ پھینکنا ہے؟"

دادی امّاں دلیل پر دلیل دیئے جا رہی تھیں۔

لیکن ان کے بیٹوں پر تو جانے کی دھن سوار تھی سو کوئی بات ان کے ارادے کو متزلزل نہ کر سکی۔ وہ دادی امّاں کو جدائی کے کرب میں مبتلا کر گئے۔ بیٹوں کی جدائی کو انھوں نے دل سے ایسا لگایا کہ بالکل گم صم ہو کر رہ گئیں ورنہ اپنے وقت کی وہ ایک زندہ دل خاتون تھیں۔ خوش مزاج خوش اخلاق اور خوش گفتار تھیں۔ امّی بتاتی ہیں کہ اپنے بچپن سے لے کر جوانی تک کے بے شمار رنگین اور سنگین قصّے وہ مزہ لے لے کر سناتیں۔ اور اب تو جب بھی بات کرتیں تو صرف ان کی، جو اُن سے دور ہو گئے تھے۔ اور وہ جو گئے تو پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔ انھیں قدم جمانے اور اپنی حیثیت بنانے میں سالوں سال بیت گئے۔

اس زمانے میں انٹرنیٹ عام نہ تھا بلکہ شاید تھا ہی نہیں۔ ٹیلی فون اور ٹیلی گرام

بھی لوگ خال خال ہی استعمال کرتے تھے۔ ہاں ہر ماہ وہ خط لکھوانا نہ بھولتیں اور ہر بار تقریباً ایک ہی جیسا مضمون رہتا۔

''عزیز از جان بیٹے خوش رہو!

کیسے ہو؟ میری جان تو تم سب میں اٹکی رہتی ہے۔ تم یہاں سے گئے کیا کہ میرے دل کے دو ٹکرے ہو گئے۔ اب میرا حال کیا پوچھتے ہو بس تم سب سے ملنے کی آس میں جیے جا رہی ہوں۔ میں تمھارے پاس جا نہیں سکتی کہ ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنی دور دراز کا سفر طے کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ ہو سکے تم ہی آنے کی کوشش کرو۔ اب میرے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔ مرنے سے پہلے ایک آخری بار تم لوگوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اب زیادہ جینے کی تمنا بھی نہیں کہ زمانے کی اُٹھا پٹک نے اندر توڑ پھوڑ سی مچا دی ہے۔ دل کی عجیب کیفیت ہے۔ سننے میں آتا ہے کہ وہاں اس سے بھی برے حالات ہیں۔ خدا تم لوگوں کو اپنے امان میں رکھے۔ (آمین)''

ہر خط دعا سلام پر اختتام پذیر ہوتا۔

خط بھیجنے کے دوسرے ہی دن سے جواب کا انتظار شروع ہو جاتا۔ یہ سلسلہ سالوں سے چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ لڑائی چھڑ گئی لیکن دادی اماں یہ پوچھنا نہ بھولتیں۔

''بیٹا! تیرے چچا کا کوئی خط وط آیا ہے؟''

''دادی اماں! میں نے آپ کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ لڑائی چھڑ گئی ہے۔ اب خط و کتابت، ٹیلی فون، ٹیلی گرام سب کچھ بند ہو گیا ہے۔ بلکہ ریڈیو پر وہاں کی خبریں سننے پر بھی روک لگا دی گئی ہے۔''

''یہ کیسا ظلم ہے؟ خود لڑیں بھڑیں لیکن یہ اپنے پرایوں کی خیر خیریت سننے پر کیوں روک لگا دی ہے؟؟؟''

''یہی قانون ہے دادی اماں۔''

''بھاڑ میں جائے یہ قانون۔'' پھر تھوڑے وقفے کے بعد پوچھا۔

''یہ لڑائی کتنے دن چلے گی بیٹی؟'' ان کی آواز کرب میں ڈوبی تھی۔

''لڑائی کی کوئی انتہا ہے دادی اماں! یہ تو چلتی ہی رہے گی۔ جب جب کوئی مسئلہ کھڑا ہوگا۔''

''اُف! اب ملک کتنے حصوں میں تقسیم ہوگا اور دل کے کتنے ٹکڑے ہوں گے؟''

ان کے چہرے پر فکر کی واضح لکیریں تھیں جیسے انھیں کوئی الہام ہوا ہو۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس کے حق میں دعا کریں۔ ان کے دل کا ایک ٹکڑا وہاں تھا تو دوسرا یہاں۔ کوئی جیتے کوئی ہارے اس سے انھیں کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ تو یہ دعا کر رہی تھیں کہ راستہ کھل جائے اور بچے اُن سے آن ملیں۔

اب دادی اماں صبح شام ریڈیو کے سامنے خبریں سننے کے لیے بیٹھ جاتیں۔ ہاتھوں میں تسبیح ہوتی۔ لب ہلتے رہتے اور آنکھوں کے کٹورے اس طرح لبالب بھر جاتے جیسے اب چھلکے کہ تب۔ وہ مجسم دعا بنی رہتیں۔ ایک صبح ریڈیو کے سامنے وہ بے حس وحرکت پڑی ہوئی پائی گئیں۔

شاید انھوں نے جنگ بندی کا اعلان سن لیا تھا۔ اور اتنی بڑی خوشی سہہ نہ سکی تھیں۔

☆☆☆

دلدل

ہفتے کی شام اسے سب نے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ چاروں چوہدی ڈھونڈ لیا گیا لیکن کہیں سراغ نہ مل سکا۔ نہ جانے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ہار پار کر سب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے۔ وہ نانی اماں کے گانو کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ ایک روز اس کی ماں اسے لے کر نانی اماں کے پاس پہنچ گئی۔

''یہ میرا بیٹا چتو ہے بی بی۔ اسے اپنے پاس رکھ لیجیے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ ای لڑکا ہم کو بڑا پریشان کر دیا ہے۔ دن بھر آوارہ چھوکروں کے ساتھ پورے گانو میں مارا مارا پھرے ہے۔ اور جب بھوک لگے ہے تو میرے کلیجے پر سوار ہو جاوے ہے۔ اب آپ ہی بتائے بی بی! بیٹھے بیٹھے ہم اپنے تینوں کو کہاں سے کھلائیں۔ آپ اسے رکھ لیجیے۔ اللہ آپ کا بھلا کرے گا۔''

اس نے ایک بار پھر نانی اماں کے پاؤں پکڑ لیے۔ اور نانی اماں کو تو نوکروں کا ہار پہننے کی عادت ہی تھی۔ جہاں ایک درجن پہلے سے وہاں ایک اور سہی۔ نانا ابا نے سنا تو کہنے لگے۔

''تمھیں تو نوکروں کی فوج اکٹھا کرنے کا خبط ہو گیا ہے۔ اتنے سارے تو پہلے سے موجود ہیں۔ اب یہ اتنا چھوٹا بچہ کیا کرے گا؟'' نانی امّاں نے آہستہ سے کہا۔

''میں اسے بلقیس کے یہاں بھیج دوں گی۔'' بلقیس یعنی میری امّی جو نزدیک ہی کے ایک شہر میں رہتی تھیں۔ نانا ابا نے خفگی سے کہا۔

''تمھیں کچھ خبر بھی ہے..... آجکل چھوٹے بچے کو نوکر رکھنا قانونی جرم ہے۔ اگر اس نے تمھارے خلاف رپورٹ لکھوا دی تو تم ایسا پھنسو گی کہ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔''

''قانون قانون قانون۔'' نانی امّاں کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا۔

''کوئی بے سہارا اور غریب بچوں کو ایک وقت کھلا تو سکتا نہیں۔ پیار کے دو بول نہیں بول سکتا اور قانون کہتا ہے کہ کوئی انھیں کام بھی نہ دے۔ قانون انھیں کام کرنے سے روک تو سکتا ہے لیکن ان کا پرابلم حل نہیں کر سکتا۔ ان کی فاقہ کشی دور نہیں کر سکتا۔ یہ قانون کے رکھوالے منہ میں صرف گز بھر کر لمبی لمبی زبان رکھتے ہیں۔ چاہے جو بھی ہو میں اسے بلقیس کے یہاں ضرور بھیجوں گی۔ اور کچھ نہیں تو ٹہل ٹکورا تو کرے گا۔ اس چھوٹے بچے کو اگر پیٹ بھر کھانا کپڑا اور تھوڑا پیار مل جائے تو کیا برا ہے۔''

نانی امّاں کے حتمی فیصلے اور دلیل کے آگے نانا ابا بیچارے ڈھیلے پڑ گئے۔ اور اس طرح چنو ہمارے گھر آ گیا۔ وہ ایک سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ ہماری ایک آواز پر 'جی آیا' کہہ کر حاضر ہو جاتا۔ ہر کام بڑی مستعدی اور سلیقے سے کرتا۔ فرصت کے وقت کاپی قلم لے کر ہمارے پیچھے پیچھے لگا رہتا۔ میں نے کہا۔

''تو تو بڑا سیانا ہے رے۔ تیری ماں ناحق تیری شکایت کرتی تھی کہ سارا دن گانو کے آوارہ چھوکروں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا اور جھگڑتا رہتا ہے۔''

''ماں ٹھیک ہی کہتی تھی۔ جب میں غریب تھا تو طرح طرح کی اوٹ پٹانگ

حرکتیں کیا کرتا تھا۔''

میں نے ہنس کر کہا۔

''تو گویا اب تو امیر ہو گیا ہے۔'' وہ جھینپ گیا۔

''میرا مطلب ہے جب انسان کا پیٹ خالی ہوتا ہے تو وہ چڑ چڑا اور جھگڑالو ہو جاتا ہے۔'' اس کی بات سن کر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ کتنے پتے کی بات کہی تھی اس نے۔ میں اندر ہی اندر اس کی سمجھداری پر داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔

اب وہ ہم لوگوں کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ تھوڑا بہت پڑھ لکھ بھی رہا تھا۔ پاپا کے دوست شرما جی ایک فلاحی ادارے کے کارکن تھے۔ اپنے کام کے تئیں وہ بڑے پر خلوص، فرض شناس اور حساس تھے۔ وہ جب بھی آتے اس موضوع پر گھنٹوں لکچر دیتے رہتے..... ہمیں یہ کرنا چاہئے ہمیں وہ کرنا چاہئے۔ غریبوں کو غربت کی دلدل سے نکالنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ ہمیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ رزق حاصل کرنے کے لیے انھیں کتنی محنت مشقت کرنی پڑتی ہے اور یہ رزق انھیں کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ ان کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر انھیں بیماریوں کے خندق میں دھکیل دیا جاتا ہے جہاں بیماریوں سے لڑتے لڑتے وہ جاں بحق ہو جاتے ہیں اور چھوڑ جاتے ہیں اپنی اولاد کو زندگی سے لڑنے کے لیے اور یہ بچے مزدوری اور محنت مشقت کی صعوبتیں جھیلتے جھیلتے قبل از وقت اپنی جسمانی اور ذہنی توانائی کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے ذمہ دار ہم ہیں۔ ہم نہ صرف ان بچوں پر ظلم کرتے ہیں بلکہ پورے معاشرے پر ظلم کرتے ہیں۔''

''پھر اس کا حل کیا ہے؟'' پاپا زیر لب پوچھتے۔

''ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ حکومت جان کر انجان بنی رہتی ہے۔''

''ہمیں حکومت کو جگانا ہوگا..... کوئی ٹھوس قدم اُٹھانا ہوگا۔ ورنہ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔''

شرما انکل بڑے جوش وخروش سے کہتے۔ ان کا ارادہ غریب اور یتیم بچوں کے لیے ایک اسکول قائم کرنے کا تھا لیکن فنڈ کی کمی کی وجہ سے وہ اپنی خواہش کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تھے۔ وہ جب بھی آتے چتو کر بڑی تنقیدی نظروں سے دیکھتے اور اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے۔

''اگر اس لڑکے کو تھوڑا موقع بھی مل جائے تو یہ بہت آگے نکل سکتا ہے۔ کبھی کبھی گودڑ میں بھی لال پیدا ہوتا ہے۔ اسے صرف تراشنے خراشنے اور چمکانے کی ضرورت ہے۔ لیکن افسوس ان کے پاس ایسا کوئی اوزار نہیں ہوتا ہے۔ اور اس طرح سیکڑوں ہیرے مٹی میں رُل جاتے ہیں۔''

چتو شرما انکل کی باتیں بڑے غور سے سنتا اور اکثر مجھ سے عجیب عجیب سوال کرتا۔

''باجی! شرما انکل جب اسکول بنائیں گے تو اس میں بہت سارے غریب بچے پڑھیں گے۔''

''ہاں! تم بھی پڑھنا۔''

''وہ فیس تو نہیں لیں گے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر ہر بچہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے گا۔ ڈاکٹر، انجینئر، ماسٹر، کلکٹر؟''

''ہاں بھئی! ہاں۔''

''تو پھر نوکروں والا کام کون کرے گا؟''

''اب ہر کام مشین سے ہونے لگا ہے۔''

''کون کون سا کام؟''

''جیسے برتن دھونا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی کرنا۔ تم بھی جلدی جلدی پڑھ کر

بڑا آدمی بننے کی کوشش کرو۔'' اس کے معصوم چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

وہ ہمارے یہاں تقریباً دو سال رہا پھر اچانک ایک شام لاپتہ ہو گیا۔ اس کے یوں غائب ہونے کا ہمیں بہت افسوس ہوا۔ ہم لوگوں نے اپنے پڑوسی رحمت علی سے اس کے بارے میں دریافت کیا کیونکہ بہت دنوں سے اُن کی نظریں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ لیکن انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔

اس کی ماں کو جب اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے زیادہ واویلا نہ مچایا حالانکہ اس کا بچہ ہمارے گھر سے غائب ہوا تھا۔ اسے ہم لوگوں کو موردالزام ٹھہرانے کا پورا پورا حق تھا۔ شاید وہ نانی اماں کے احسانوں کے زیر اثر خاموش ہو گئی تھی۔

اس واقعہ کو کافی دن ہو چکے تھے۔ چنو ہم لوگوں کے ذہن سے تقریباً نکل چکا تھا۔ پاپا ہر گرمی کی چھٹی میں کسی نہ کسی ہل اسٹیشن پر ضرور جایا کرتے تھے۔ اس دفعہ ہم لوگوں کا شملہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک ہفتہ تک ہمارا قیام رہا۔ خوب تفریح رہی۔ خوب لطف اُٹھایا۔ واپسی سے ایک روز قبل صبح سویرے ہی تفریح کے لیے نکل گئے۔ سارا دن مختلف مقامات کی سیر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ جب بھوک کھل کر لگنے لگی تو ایک ریسٹوراں کا رخ کیا۔ کھلے صحن میں چھتری کے نیچے بیٹھ کر ہم نے چائے اور کچھ نمکین وغیرہ کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چودہ پندرہ سال کا لڑکا پھٹی پرانی پینٹ اور میلی کچیلی بنیائن پہنے چائے کا ٹرے لیے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں گرد و غبار سے اَٹے تھے۔ میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ چائے کی پیالی اُس کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی۔

''ارے چنو..... تُو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ وہ نظریں نیچی کیے کھڑا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تو بغیر بتائے ہوئے ہمارے یہاں سے کیوں بھاگ آیا۔ کیا وہاں تجھے کوئی

تکلیف تھی؟''

''نہیں باجی! اس گھر میں تو مجھے اپنوں جیسا پیار ملا تھا۔''

''تو پھر تو نے ایسا کیوں کیا؟''

''یہ میری مجبوری تھی۔ ماں کو زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی کیونکہ میرے چھوٹے بھائی بہن بھوکوں مر رہے تھے۔''

''تو کیا تجھے یہاں زیادہ پیسے ملتے ہیں؟''

''ہاں!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی اور میرا ذہن مختلف خیالوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شرما انکل یاد آ رہے تھے۔ ان جیسے بہت سارے لوگ صرف سوچتے اور ارادہ کرتے ہی رہ جائیں گے۔ اپنے مشین کو عملی جامہ پہنا کر کامیاب بنانا بہت کٹھن ہے۔ میں نے چلتے وقت اس کی پلیٹ میں ٹپ کے طور سو کا نوٹ رکھ دیا اور کہا۔

''چتو! تجھے جب بھی میری ضرورت پڑے بلا دھڑک میرے پاس آجانا۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا بس شکر گزار نگاہوں سے نوٹ کی طرف دیکھتا رہا۔

☆☆☆

(شاعر، فروری ۲۰۰۹)

خالی ہاتھ

وہ روز صبح سویرے اٹھتے ہی سب سے پہلے اشنان کرتا پھر ہاتھ جوڑ کر لکشمی دیوی کی مورتی کے سامنے کھڑا ہو کر پرارتھنا کرتا۔

''ہے لکشمی ماں! مجھ پر اسی طرح کرپا کرتی رہنا۔ میری تجوری کو ہر دم بھری پُری رکھنا۔ اسے کبھی خالی مت ہونے دینا۔''

کبھی کبھی وہ اپنی تجوری کھول کر دیکھتا جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آجاتی۔ وہ ہمیشہ اپنی تجوری کی چابی اپنے پاس رکھتا۔ پیسہ کے معاملے میں اسے کسی پر بھروسہ نہ تھا۔

وہ ایک کلرک تھا۔ اسے یاد نہیں کہ آفس جانے کے لیے اس نے کبھی کسی سواری کا استعمال کیا ہو۔ چاہے جاڑے کی کہر آلود صبح ہو یا گرمی کی چلچلاتی دھوپ یا پھر برسات کی گھن گرج یا موسلا دھار بارش..... وہ پیدل ہی آتا جاتا کہ آخر بھگوان نے یہ دو ٹانگیں اور یہ لمبا چوڑا شریر کس لیے بنایا ہے۔ یہ کب کام آئے گا؟

کبھی کبھی بیوی کہتی کم سے کم ایک سائیکل ہی خرید لو۔ لیکن بیوی کی باتوں پر اس نے کبھی کان نہیں دھرا۔ جب بیوی میکے جاتی تو صرف چاول اور چوکھ پر گزارا کرتا۔

صبح ناشتے کے طور پر ایک گلاس ستو گھول کر پینا روز کا معمول تھا۔ رات کو کسی سستے چائے خانے میں بیٹھ کر ایک کپ چائے اور دو چار بسکٹ پر اکتفا کرتا اور اگر کبھی باہر جانے کا دل نہ چاہتا تو بس دو گلاس پانی پی کر بھگوان کا شکر ادا کرتا۔ اس طرح اس کی جمع پونجی میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہا اور بھرتی ہوئی تجوری اسے تقویت بخشتی رہی۔

ادھر کئی دنوں سے وہ بیحد پریشان تھا۔ اسے کوئی کل چین نہ آ رہا تھا۔ یوں تو یہ اس کا روز کا معمول تھا لیکن جب ٹیکس ادا کرنے کا وقت آتا تو اس کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ ساری ساری رات وہ اپنی جمع پونجی کا حساب کرتے گزار دیتا۔ پھر جھلا کر سوچتا۔

''یہ کیسا قانون ہے، محنت کریں ہم، خون پسینہ بہائیں ہم، اپنی چھوٹی سے چھوٹی کا خواہشوں کا گلا گھونٹیں ہم۔ پھر یہ ساجھے داری کیسی؟''

اس نے ٹیکس بچانے کے لیے کون کون سے جتن نہ کیے۔ کتنے شیئر خریدے۔ کتنی ایل آئی سی کی پالیسی خریدی پھر بھی سال میں ایک بار اس کی جمع پونجی کا ایک بڑا حصہ ہاتھوں سے نکل جاتا۔ اس خسارہ کا سوگ وہ مہینوں مناتا رہتا۔ پھر صبر کر کے نئے سرے سے پائی پائی جوڑنے میں لگ جاتا۔

ایک دن جب وہ آفس سے آیا تو بیوی نے بتایا۔

''آج ببلو آیا تھا۔ اگلے مہینے کی سات تاریخ کو آنند کا بیاہ ہے۔ وہ نیوتا دے کر گیا ہے۔'' وہ خاموش رہا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

اس نے پھر کہا۔

''اچھا ہے..... اسی بہانے سب سے بھینٹ ہو جائے گی۔ شادی ویواہ ہی تو ایک ایسا اوسر ہے جب سب اکٹھے ہوتے ہیں۔'' وہ پھر بھی خاموش رہا تو بیوی نے جھنجھلا کر کہا۔

''تم چپ کیوں ہو کچھ بولتے کیوں نہیں؟''

''کیا بولوں تیری تو بدھی ماری گئی ہے۔ دیکھ نہیں رہی گرانی آسمان کو چھو رہی

ہے۔ لوگوں کو دو وقت کی روٹی جٹانی مشکل ہو رہی ہے۔ اور تجھے نیوتا پہانی کی سوجھ رہی ہے کیا ایک دو پیسہ کا سوال ہے۔ یہاں تو ڈیوڑھی سے پاؤں نکالنے کی دیر ہے پیسہ ہاتھوں سے پھُر پھُر اس طرح اُڑ جاتا ہے جیسے اسے پر لگ گئے ہوں۔''

''اگر تم کسی کے دکھ سکھ میں ساتھ نہ دو گے تو تمھیں کون پوچھے گا۔'' بیوی نے خفگی سے کہا۔

''اری بھاگوان! کبھی تو عقل کی بات کیا کر۔ اگر ہم پیسہ یونہی موج مستی میں اُڑاتے رہے تو جو بھگوان نے یہ دو پیارے پیارے بچے دیئے ہیں ان کا پالن پوسن کیا تیرے میکے والے کریں گے؟''

''شبھ شبھ بولو جی! بھگوان نہ کرے تمھارے رہتے بھر میرے میکے والے کیوں ہمارے بچوں کا پالن پوسن کرنے لگے۔''

''تو پھر جہاں ہو وہیں شانتی سے بیٹھو۔''

''تم کچھ بھی نہ کرو گے۔ اب تک زندگی میں سوائے تجوری بھرنے کے اور کیا ہی کیا ہے۔'' وہ منہ ہی منہ بڑبڑاتی رہی۔

جب بچے پڑھنے کے لائق ہوئے تو انھیں پاٹھ شالہ میں ڈال دیا گیا۔ جب کچھ اور بڑے ہوئے تو ایک سرکاری اسکول میں داخلہ دلوادیا گیا جہاں نہ صاف ستھرے یونیفارم کا چکر تھا۔ نہ کوئی تام جھام، نہ ناز نخرہ۔ بھگوان کی کرپا سے بچے تیز تھے۔ میٹرک پاس کرلیا۔ جب کالج میں ایڈمیشن کا وقت آیا تو ایک بھاری رقم اس کی مٹھی سے نکل گئی جس نے کئی دنوں تک اس کی آنکھوں سے نیند اڑادی۔ معاملہ یہیں تک ختم نہیں ہوا۔ ساتھی سنگاتی کو دیکھ کر بچوں نے پر پرزے نکالنے شروع کردیئے۔ اب انھیں نئے فیشن کے پوشاک، نئے ماڈل کے جوتے، بڑھیا بھوجن اور رہن سہن چاہیے تھا۔ ادھر بیوی بیمار رہنے لگی تھی۔ اس کی بیماری کو نظر انداز بھی کیا جاسکتا تھا۔ لیکن لامحالہ اسے بچوں کی فرمائشیں تو پوری کرنی ہی تھیں۔

گریجویشن کے بعد بچوں کو آگے پڑھانا اب اس کے بس کی بات نہ تھی۔ بچے بھی تنگ آ کر نوکری کی کھوج میں اِدھر اُدھر نکل گئے۔ باپ نے بھی سوچا، چلو اچھا ہوا۔ ان دونوں نے تو مجھے کنگال ہی بنا دیا تھا۔ جب خود پر پڑے گی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ مورکھ اتنا نہیں جانتے کہ کوئی لاکھ کما لے لیکن اگر اس کی تجوری خالی ہے تو وہ ایک کھوکھلے پیڑ کی طرح ہے جو کسی وقت بھی گر سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن بیٹے لوٹ کر اسی کے پاس آئیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ ادھر بیوی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ بیٹوں کی جدائی نے اسے لب گور کر دیا تھا۔ وہ پتی کی طرف شاکی نظروں سے دیکھتی جیسے وہی اس کی بیماری کا کارن ہو۔ اسی نے بیٹوں کا اس سے جدا کریا ہو۔ کبھی اس سے کہتی۔

''بچوں کو لکھ دو کہ جب بھی فرصت ملے وہ آ جایا کریں۔''

''کیسی نادانی کی باتیں کرتی ہو۔ جب بھی لمبی چھٹی ہو گی وہ خود آ جائیں گے۔ ایک دو دن کے لیے آنا کیا سمجھو ہے؟ آنے جانے میں کیا کم پیسہ خرچ ہوتا ہے؟''

''پیسہ..... پیسہ..... پیسہ..... پیسے کی موہ مایا نے اب تک تمھارا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔''

اور ایک دن بیوی نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ تن تنہا رہ گیا۔ لیکن اب وہ بہت ہی کمزور ہو چکا تھا۔ اسے اچھا کھانا اور آرام نصیب نہ تھا۔ روز بروز اس کی صحت خراب ہوتی جا رہی تھی۔

پھر ایک دن اچانک اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ جب تک پاس پڑوس والے آتے وہ پیسے کی موہ مایا سے مکت ہو چکا تھا۔ اسے ایک خوراک دوا کھانے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ جس پیسے کو اس نے بہت ہی جتن سے سینت سینت کر رکھا تھا وہ اسے کچھ کام نہ آ سکا۔

☆☆☆

ڈے ڈریمر

کسی دانشور نے کہا ہے کہ عقلمندوں اور بے وقوفوں کے کئی اقسام ہوتے ہیں۔ میرا دوست ندیم انھی اقسام میں سے ایک تھا۔ ہم دونوں بچپن کے لنگوٹیا یار تھے۔ اسکول سے لے کر کالج تک ہم ایک دوسر کے راز داں اور مشیر کار تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ کسی کے مشورے پر عمل کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ عقلمندوں کی فہرست میں وہ خود کو سب سے اوپر تصور کرتا تھا۔ اگر کبھی کوئی اسے مشورہ دیتا تو وہ اس انداز سے مسکراتا جیسے اس کے علاوہ دنیا میں سارے لوگ بے وقوف ہیں۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی خامی تھی۔

وہ ایک ڈریمر تھا..... ڈے ڈریمر۔ بڑے اونچے اونچے خواب دیکھتا۔ بڑے بڑے محلات تعمیر کراتا۔ بڑی بڑی گاڑیوں میں سیر کرتا۔ غرض ہمیشہ ہوا کے دوش پر پرواز کرتا رہتا۔ وہ اکثر میرے کمرے میں آدھمکتا۔ اس کی آمد کسی اندھی طوفان سے کم نہ ہوتی۔ ایک دن آتے ہی شروع ہوگیا۔

''یار! ان موٹی موٹی کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ ان میں کیوں دماغ کھپاتا ہے؟ تجھے کیا چاہئے؟؟ پیسہ ہی نا..... تو اس کے لیے اتنی مغزماری کیوں؟؟؟ عقل سے کام لے۔ آنکھیں کھول کر دنیا دیکھ۔ یہ جو لکھ پتی کڑوڑ پتی ہیں جن کی توندیں بسیار خوری

کی وجہ سے غبارہ کی طرح پھولی ہوئی ہیں وہ کتنے پڑھے لکھے اور قابل ہیں۔ میری مان تو ان کتابوں کو قفل لگا دے اور اس دوڑ میں شامل ہو جا جو دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔''

''بکواس بند کرے گا یا میں تجھے اُٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دوں۔''

''کیوں خفا ہوتا ہے یار! میں تیرے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔''

''اور میں بھی ہمیشہ تیرے بھلے کے لیے ہی کہتا ہوں کہ یہ سب خرافات دماغ سے نکال دے۔ تجھے پتہ ہے..... یہ جو دوڑ ہے نا وہ بہت ہی خطرناک ہے۔ دوڑنے والے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دوڑتے ہیں۔ ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں میری مان تو بھی سہل راستہ اختیار کر۔ منزل خود بخود مل جائے گی۔ اور یاد رکھ..... کتابوں کو قفل لگانے کی بات کبھی نہ کرنا۔''

میری باتیں سن کر وہ خاموشی سے سر جھکائے چلا گیا۔

ایک دن جب وہ کالج آیا تو اس کے بال صفاچٹ تھے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ابھی سے یہ گنجا پن کیوں؟ ابھی تو اولے پڑنے باقی ہیں۔''

''چھوڑ یار! کیوں مذاق کرتا ہے۔ تو سچ ہی کہتا ہے۔ سب سے پہلے پڑھائی پھر کچھ اور۔ تیرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں پڑھائی پر پورا دھیان دے رہا ہوں۔ اسی لیے سر بھی منڈوا لیا ہے۔ یہ بال سالے بڑا پریشان کرتے ہیں۔ اس میں بڑے نخرے ہیں۔ دن دن میں دس بار برش کیجیے۔ کریم لگائیے۔ تیل ڈالیے اور ہفتے ہفتے شیمپو کیجیے۔ سوچا کیوں نہ اسے صفا ہی کر دوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

''گڈ۔ دیر ہی سے سہی تجھے عقل تو آئی۔'' میں نے اسے شاباشی دی۔

کچھ دنوں تک وہ اپنے قول پر قائم رہا پھر خود کو عقلمندوں کی اگلی صف میں سمجھنے

والا بے وقوفی کی انتہا کو پہنچ گیا۔ بے وقوفی کے علاوہ رومان اور جذبات ..... یہ دو صفتیں بھی اس کی فطرت میں شامل تھیں۔ جذبات میں آ کر کبھی کبھی وہ ایسے قدم بھی اٹھا لیتا کہ اس کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا۔

بی اے فائنل اکزام کو چند مہینے باقی تھے کہ اسے ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ اور عشق بھی اللہ کی پناہ ایسا دھواں دھار کہ زہر کھانے کی نوبت آتے آتے بچی۔ عشق کی ناکامی نے اسے اتنا دل برداشتہ کر دیا کہ کوچۂ لیلیٰ سے کوچ کر کے دیارِ غیر میں پناہ گزیں ہوا۔ وہاں بغیر ساز و سامان کے ہفتوں مہینوں دھکے کھاتا رہا۔ کئی کئی دن فاقے کی نوبت آئی۔ اسی طرح آوارہ گردی کرتے ہوئے ایک شخص سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کا نام رستم تھا۔ رستم اسکی نبض پہچان کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ ایک اثر ورسوخ والا شخص تھا۔ اسے ایک چھوٹی سی نوکری دلوا دی اور کمیشن لیتا رہا۔ وہ بڑی ہی دل جمعی سے کام کرنے لگا۔ رات دن ڈیوٹی کرتا تاکہ اتنی رقم جمع ہو جائے جس سے وہ اپنا بزنس شروع کر سکے۔ لیکن بزنس کا بھوت سر سے اُترا تو پھر ایک جاب کر لی۔ کچھ دنوں تک وہ خوش رہا لیکن پھر وہاں سے اس کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ وہ ایک سیمابی کیفیت والا انسان تھا۔ کسی ایک جگہ کسی ایک کام میں زیادہ دنوں تک ٹکنے والا نہ تھا۔ قناعت پسند اور شکر گزار نہ تھا۔ اور پیسے کی ہوس نے اسے بے کل کر رکھا تھا۔ اب پھر وہ بہت زیادہ خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس دفعہ پرواز اور بھی اونچی تھی۔ اب وہ ہزاروں لاکھوں کی نہیں کڑوڑوں کی سوچتا۔ فلیٹ مکان کی نہیں بنگلہ کوٹھی کی وہ سوچتا۔ اگر اب تک میں کچھ نہ کر سکا تو کیا ہوا۔ انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ اپنا کام کوشش کرتے رہنا ہے۔ انشاءاللہ کامیابی ضرور ملے گی۔ پیسہ میرے گھر کی باندی ہو گی۔ پھر سیاست میں آجاؤں گا۔ الکشن میں کھڑا ہوں گا اور کامیابی میرے قدم چومے گی۔ پھر سیاسی کرسی پر بیٹھ کر ملک کو بدل ڈالوں گا۔ معاشرے کی ساری برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا۔ پھر ایک روشن صبح امن اور شانتی کا

پیغام لے کر طلوع ہوگی۔

اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے اور اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے ریزائن دے کر اس نے بڑے تام جھام سے اپنا بزنس شروع کیا۔ محنت کے ساتھ ساتھ پیسہ بھی پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ دوست احباب بڑے بڑے سبز باغ دکھا کر دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اب تک کی کمائی ہوئی ساری پونجی ختم ہوگئی۔ وہ بالکل کنگال ہوگیا۔ کھانے کے لالے پڑ گئے اور نوبت یہاں تک آگئی کہ گھر کا خرچ پورا کرنے کے لیے وہ پارچون کا تھوڑا سامان جھولے میں لے کر سارا دن گلی کوچوں میں گھومتا رہتا۔

بہت دنوں بعد جب میں اس سے ملا تو اسے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو نے اپنا یہ کیا حال بنا لیا ہے میرے بھائی! اسی لیے منع کرتا تھا کہ زیادہ خواب نہ دیکھا کر۔''

لیکن اس کے حوصلے اب بھی بلند تھے۔ وہ اس فکر میں رہتا کہ کہیں سے کچھ پیسوں کا انتظام ہو جائے تو اب بھی وہ اپنے خواب کی تعبیر پا سکتا ہے۔

☆☆☆

(آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ)

خلا

اس بلندی پر تاحدِ نگاہ خلا ہی خلا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ تھک کر چور ہو گیا ہے۔ اب تو قوتِ پرواز بھی دم توڑ چکی ہے۔ وہ چاہ کر بھی نیچے واپس نہیں جا سکتا۔ جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

جب اس بلندی پر پہنچنے کے لیے سفر کا آغاز کیا تھا تو پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اسے فرصت نہ ملی تھی۔ کبھی اپنے سراپے پر نظر نہ ڈالی تھی۔ چلتا رہا، چلتا رہا۔ منزلیں پیچھے چھوٹتی گئیں۔ وقت آگے بڑھتا گیا۔ یہ مسافت صدیوں پر محیط تھی اور اب جب وہ اپنے سراپے پر نظر ڈالتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ کیا یہ وہی ہے جو کبھی مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا شاہکار تھا؟ اس کی پرکشش شخصیت سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ بیشمار لڑکیاں جس کی گرویدہ تھیں۔ اس کی ایک نظر التفات کی خواہاں۔ اس سے باتیں کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھیں۔ لیکن وہ ان کے سائے سے اس طرح بھاگتا تھا جیسے وہ کوئی بھوت ہوں جو اس سے چمٹ سی جائیں گی۔ اس کے پیش نظر تو بس اپنا مستقبل اپنا کیئریر تھا۔ وہ اس محرومی کو دور کر دینا چاہتا تھا جس نے اس کے بچپن کی معصوم شرارت، لڑکپن کے لاابالی پن اور جوانی کی امنگوں کو نگل لیا تھا۔ وہ اس وقت کو کبھی نہیں بھول پاتا

تھا جب بوسیدہ ملگجے اور بیشمار داغ دھبوں سے بھرے ہوئے یونیفارم پہن کر اسکول جاتا جس کے لیے اکثر اسے سزا ملتی۔ ٹوٹے جوتوں کو چھپانے کی کوشش میں لڑکھڑا لڑکھڑا چلتا۔ اس کے دوستوں کے ٹفن میں طرح طرح کے پکوان ہوتے اور اس کے ٹفن میں سوکھی روٹی کے ساتھ اچار یا پیاز کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا۔ گھر کی خستہ حالی نے اسے قبل از وقت بہت ہی حساس بنا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت کے بجائے محرومی رہتی اور ہر وقت کچھ کرنے کچھ پانے کی فکر میں مبتلا رہتا۔ جب اس نے پہلی بار اپنی ماں کی ہتھیلی پر چند سکے رکھے تو وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ لیکن ماں گھبرا گئیں۔

''یہ پیسے تو کہاں سے لایا؟'' وہ زمانے کے رنگ ڈھنگ سے خوف زدہ تھیں۔

''کہیں تو نے چوری تو نہیں کی؟ کسی کی جیت تو نہیں کاٹی؟؟''

ماں کے تیور دیکھ کر وہ بھی گھبرا گیا۔

''نہیں امّی! میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ یہ میری اپنی کمائی کے پیسے ہیں۔

''بیٹا! ابھی سے تو بکھیڑوں میں کیوں پڑ گیا ہے۔ ابھی تو تیرے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں۔''

پھر جب بھی وہ ماں کے ہاتھوں میں پیسے تھماتا، وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

ایک دن جب اس نے پورے پانچ سو روپے ماں کو دیئے تو وہ کبھی بیٹے کو اور کبھی روپے کو دیکھتیں۔

''یہ اتنے پیسے تو کہاں سے لایا؟'' ماں اب بھی خوفزدہ تھیں۔

''آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں امّی؟ اب میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ پورے بائیس سال کا ہو چکا ہوں ور بی اے کا اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''ہاں بیٹا! میں دن رات یہی دعا کرتی ہوں کہ جلد سے جلد تو اپنی پڑھائی

پوری کر کے کسی روزگار میں لگ جائے تو میں رومانہ کو بہو بنا کر اس گھر میں لے آؤں۔ اب ان بوڑھی ہڈیوں میں گھر سنبھالنے کی طاقت نہیں رہی۔ وہ لوگ بھی کئی بار مجھے میرا وعدہ یاد دلا چکے ہیں۔''

ماں کی باتیں سن کر رومانہ چھم سے اس کے تصور میں آ گئی۔ وہ بھولی بھالی پیاری اور الھڑ سی لڑکی جس کے ساتھ اس نے اپنے بچپن کے بہت سارے دن گزارے تھے۔ جب تک تھوڑی دیر اس کے ساتھ کھیل نہ لیتا اسے چین نہیں آتا لیکن ہمیشہ کھیل کا اختتام لڑائی پر ہوتا۔ نہ جانے کیوں اسے چھیڑنے اور رلانے میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔ کئی بار اس کی گڑیا اس کے ہاتھوں زخمی ہوئی تھی اور اب جب بھی وہ چچا کے گھر جاتا رومانہ نہ جانے کون سے کھدرے میں دبک جاتی اور وہ مایوس لوٹ آتا۔

خدا خدا کر کے اس کی پڑھائی پوری ہوگئی اور اسے چھوٹی موٹی نوکری بھی مل گئی لیکن وہ اس نوکری سے مطمئن نہ تھا۔ اتنے میں دو وقت کی روٹیاں تو مہیا ہو سکتی تھیں لیکن وہ عیش عشرت، وہ گاڑی، وہ بنگلہ۔ اسے اپنا یہ خواب پورا کرنا تھا۔ دوستوں کے ہم پلہ بن کر جینا تھا۔ اس نے نوکری چھوڑ دی اور ایک دوست کی پارٹنر شپ میں اپنا کاروبار شروع کیا۔ پھر اسے نہ کھانے پینے کا ہوش رہا نہ کسی اور بات کا۔ اس سلسلے میں اکثر وہ دوسرے شہر بھی جایا کرتا۔ کبھی کبھی ہفتوں گھر سے غائب رہتا۔ تنہائی سے گھبرا کر ماں نے کہا۔

''بیٹا! سوچتی ہوں اب تیرا گھر بسا ہی دوں۔ کب تک تنہائی کا عذاب جھیلتی رہوں گی۔ رومانہ کے ماں باپ کو بھی جلدی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے اگر آپ کو ابھی دیر ہے تو ہم کہیں اور رشتہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا اور پل ہی بھر میں رومانہ پھٹے پرانے کپڑوں، اُداس اور مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے خیالوں میں آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔

''کیوں قید کیا مجھے جب کوئی سکھ نہیں دے سکتے تھے۔''

اور ایک لمحے کے اندر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

''نہیں امّی نہیں۔ میں ابھی اس جھمیلے میں پڑتا نہیں چاہتا۔ ابھی تو بزنس کی شروعات ہے۔ ابھی تو مجھے بہت آگے جانا ہے۔ چچا سے کہیئے تھوڑا اور انتظار کریں۔''

اب وہ بزنس کے سلسلے میں بیرون ملک بھی جایا کرتا تھا۔ پہلی بار جب وہ دو ماہ بعد واپس آیا تو رومانہ کے گھر شہنائیاں بج رہی تھیں۔ پنڈال سجا تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی لیکن اس کی آنکھیں اور کان بے حس ہو چکے تھے۔ نہ وہ کچھ دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا۔ ساری رات وہ بے چین رہا۔ ماضی کی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں۔ وہ شروع ہی سے رومانہ پر اپنا حق جمائے بیٹھا تھا۔ اسے اپنی جائیداد سمجھتا تھا جس پر کسی غیر کا قبضہ ہوتے ہوئے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے ماں کے ہزار بلانے پر بھی وہ باہر نہیں نکلا تھا۔ بہت دنوں تک وہ اپنی من پسند ہستی کے چھن جانے کا سوگ مناتا رہا۔ پھر کسی طرح خود کو سنبھال کر اپنے کام میں لگ گیا۔

کچھ دنوں بعد ماں نے پھر کہنا شروع کیا۔

''اب تو شادی کر لے بیٹا! کیا تیرے لیے دنیا میں لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے۔''

''اب اتنی جلدی کیا ہے امّی، تھوڑا اور انتظار کر لیں۔''

اور یہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی وہ اپنے کاروبار کو فروغ دیتا رہا۔

اگلی بار ماں کی علالت کی خبر پا کر جب وہ بھاگم بھاگ گھر پہنچا تو ماں کا جنازہ آخری آرام گاہ تک جانے کے لیے تیار تھا۔

اسے ایک زبردست دھکا لگا۔ ایک ایسی قیمتی شے اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی جس کا کوئی بدل نہ تھا۔ یہ دوسرا جھٹکا تھا جس نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ احساس

زیاں کسی پل چین لینے نہیں دے رہا تھا۔ برسوں آنسوں بہاتا رہا۔

اب کوئی اسے یہ کہنے والا نہ تھا کہ؛

''اس کٹھن رستے پر تو اپنی زندگی کے دن تنہا کیسے گزارے گا بیٹا؟''

لیکن وقت کہاں رکا ہے وہ تو گزر ہی جاتا ہے۔

اوراب بہت سارا وقت گزر چکا تھا۔ کئی شہروں میں اس کے عالیشان بنگلے اور کئی گاڑیاں تھیں۔ بینک بیلنس تھا لیکن اسے سکون اور چین نہ تھا۔

گزرتا وقت انسان کی جھولی میں بہت سارے تحفے ڈال جاتا ہے۔

کبھی غم، کبھی خوشی، کبھی راحت، کبھی کرب.....اوراب یہ کرب اسے اتنا بے چین کرتا کہ وہ ساری ساری رات سو نہیں سکتا۔ اسے نیند کی گولی لینی پڑتی۔ لیکن اب وہ بھی بے اثر ہوتی جارہی تھیں۔ وہ سوچتا.....زندہ رہنے کے لیے زندوں کا قرب ہی سکون بخشتا ہے۔ یہ مادی چیزیں، یہ سونا چاندی، یہ بنگلہ گاڑی، قلبی سکون نہیں دے سکتے۔ قانونِ قدرت کی پابندیوں سے انحراف کر کے مادّی فائدوں کے پیچھے دوڑنے والوں کو نہ دنیا ہی ملتی ہے اور نہ آخرت ہی۔ وہ بے حد پشیمان تھا۔

اب اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ناگ ہو جو سونے چاندی کی ڈھیر پر اپنا پھن کاڑھے بیٹھا ہے۔

☆☆☆

(فنون، اپریل ۲۰۰۷)

احساسِ شکست

وہ بے حد اُداس اور خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن سوچ کی ان ناہموار وادیوں میں بھٹک رہا تھا جہاں اس کی خوشیاں گم ہوگئی تھیں۔ کل ہی وہ لندن کی سیر سے واپس آئی تھی۔ اب تک وہ تقریباً آدھی دنیا کی سیر کر چکی تھی لیکن کہیں بھی اسے کوئی چارم، کوئی خوشی نہ مل سکی تھی جیسے اس کے اندر خوشیوں کے سارے چراغ گل ہو چکے ہوں۔ وہ سوچتی آخر ایسا کیوں ہے؟

وہ تو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔

جہاں وہ بیاہ کر آئی تھی وہ بھی ایک بھرا پُرا گھر تھا جہاں مخلوط خاندان آباد تھے۔ وہ سبھوں کے بیچ رانی بنی رہتی۔ لیکن جب شوہر کو دیکھتی تو مور کی طرح مرجھا جاتی کہ وہ لاغر سا ایک معمولی خدوخال والا سیدھا سادہ بندہ تھا۔ تصنع بناوٹ سے بے نیاز، چھل کپٹ سے دور، اور یہی اس کی سب سے بڑی خامی تھی۔ شوہر کی خامیاں کانٹوں کی طرح آنکھوں میں چبھتی رہتیں۔ کئی خامیوں کے علاوہ ایک خامی یہ بھی تھی کہ اب تک وہ بے روزگار تھا۔ ہر وقت بیوی کے پہلو سے لگا بیٹھا رہتا۔ تب کزنس چھیڑتیں۔

”اتنی پیاری نازک سی دردانہ بھابھی اور بے چارے کامل بھائی ایسا لگتا ہے

جیسے حور کے پہلے میں لنگور۔'' یہ جملہ اس کے زخم پر نمک کا کام کرتا۔ وہ ہر وقت جلتی کڑھتی اور اپنی قسمت سے شکوہ کرتی رہتی۔

اس کا نام دردانہ تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے وہ موتی کی طرح چمکیلی اور شفاف تھی.....تیز طرار اور خود پسند۔ وہ ہمیشہ احساس برتری میں مبتلا رہتی۔ یہ احساس اس وقت اور دوبالا ہو جاتا جب لوگ اس کا گن گان کرتے۔ وہ تفاخر کی بلندیوں پر پہنچ جاتی۔

لیکن وہ اتنا گیا گزرا اور نا اہل بھی نہ تھا۔ جلد ہی گلف میں فیملی ویزا کے ساتھ اسے جاب مل گئی۔ وہاں کچھ دنوں تک دونوں بہت خوش رہے۔ لیکن کامل جب آفس میں ہوتا تو وہ تنہائی سے گھبرا جاتی۔ وہ بہت ہی زندہ دل اور انجوائے کرنے والی تھی۔ جلد ہی اس نے اپنا حلقہ احباب بنالیا۔ ہر ہفتہ باری باری سب کے گھر محفل جمتی۔ نئے دوستوں میں شاہد سب سے زیادہ تیز طرار اور ہر دل عزیز تھا۔ دردانہ سے اس کی خوب نبھنے لگی۔ وہ وقت بے وقت دردانہ کے گھر پہنچ جاتا۔ کامل کی موجودگی یا غیر موجودگی کی کوئی قید نہ تھی۔ وہ بہت ہی پر لطف باتیں کرتا۔ روتے کو ہنسانے والا اور سوتے کو جگانے والا تھا۔ دردانہ اس کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اگر وہ کبھی نہ آتا تو اسے خالی پن کا احساس ہونے لگتا۔ ویسے بھی اس میں جنس مخالف کے لیے بے حد کشش تھی۔ دردانہ غیر محسوس طریقے سے اس سے قریب اور شوہر سے دور ہوتی جارہی تھی۔ شاہد اکثر اسے یہ احساس دلاتا کہ اس کا شوہر اس کے لائق نہیں ہے۔

''تعجب ہے کیسے تم ایک ایسے شخص کے ساتھ گزارہ کر لیتی ہو جس کا دل ہر طرح کے جذبات سے عاری ہے۔ تمھارے شب و روز کیسے کٹتے ہیں؟ تمھاری زندگی میں تو کوئی چارم ہی نہیں۔''

اور وہ تو تھی ہی ڈھل مل یقین۔ دھیرے دھیرے ان ہمدردی بھری باتوں کے شکنجے میں جکڑتی چلی گئی۔ اس کے خوابیدہ ارمان جاگنے لگے۔ بجھتی ہوئی چنگاریاں پھر سے

بھڑ کنے لگیں۔ وہ سوچتی .....سچ ہی تو ہے۔ کیا دیا اب تک کامل نے اسے؟ ایک سرد اور بے کیف سی زندگی۔ وہ ہر وقت ٹینشن میں رہنے لگی۔ کامل اپنی فطرت کے مطابق ان سب باتوں سے بے نیاز تھا لیکن شاہد نے اس سے خوب خوب فائدہ اُٹھایا۔ وقتاً فوقتاً نفرت کا زہر اس کے حلق میں اُتارتا رہا اور جب زہر نے اپنا کام کر دکھایا تو موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جسے کہنے کے لیے بہت دنوں سے وہ پر تول رہا تھا۔

''دردانہ! کیا تم اپنی اس زندگی سے خوش ہو؟ تم خود سوچو اب تک کیا دیا تمھیں تمھارے شوہر نے اور وہ کیا دے سکتا ہے؟ تمھاری زندگی میں تمھارے شایان شان کچھ بھی تو نہیں۔ کبھی اس کے ساتھ آئینے میں خود کو دیکھا ہے؟ یہ زندگی، یہ حسن، یہ جوانی کیا پھر کبھی لوٹ کر آئیں گے۔ اسے ضائع نہ ہونے دو۔ اپنی اس بے کیف زندگی سے باہر آ کر تو دیکھو تمھارا قدرداں تمہارا منتظر ہے۔''

وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ شاہد کب وہاں سے چلا گیا اور کامل کب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔

''کیا سوچ رہی ہو دردانہ؟ آج آفس میں کام زیادہ تھا اس لیے آنے میں دیر ہو گئی۔'' کامل نے اس کا ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جسے اس نے بڑی ناگواری سے جھٹک دیا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے لیے کون سی دلچسپی کا سامان فراہم کر لیتے؟''

کامل نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک مغموم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر اُٹھی۔ کئی دنوں تک دردانہ کے ذہن میں آندھیاں چلتی رہیں۔ دل اور دماغ میں ایک جنگ چھڑی تھی جس نے اس کے اندر سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ کبھی دل کی سنتی کبھی دماغ کی۔ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ کس کے حق میں فیصلہ دے۔ ادھر شاہد اس سے مل کر انڈیا چلا گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا کہ وہ کوئی فیصلہ کر لے اور اس فیصلے سے اسے

آگاہ کردے تاکہ دونوں ایک نئی زندگی کی شروعات کرسکیں۔

شاہد کی باتوں نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا۔ وہ کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''کامل! مجھے اس قید و بند سے آزاد کر دیں۔ میں آپ کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ مجھے ایک مضبوط اور مستحکم سہارے کی ضرورت ہے۔'' کامل کو اس غیر متوقع مطالبے کی قطعی اُمید نہ تھی۔ اسے ایسا لگا کہ کہیں آس پاس ہی ایک طاقت ور بم پھٹا ہو جس نے اس کے وجود کو پاش پاش کر دیا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ دردانہ سے پسند نہیں کرتی لیکن یہ ناپسندیدگی اتنی حدیں پار کر جائے گی، ایسا اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا۔ وہ اس سے لاکھ بے زار سہی لیکن دردانہ کی محبت کی جڑیں اس کے دل کے اندر بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں جسے اُکھاڑ پھینکنا اتنا آسان نہ تھا۔

کامل نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''دردانہ! اتنی کٹھور نہ بنو۔ میں تمھارے بغیر تنہا کیسے رہ پاؤں گا؟''

وہ آبدیدہ ہو گیا۔

لیکن وہ تو پتھر کی بن چکی تھی۔ اس کے آنسو دردانہ کے ارادے اور فیصلے میں کوئی ڈرار نہ ڈال سکے۔ اس کے لیے اب وہاں ایک پل بھی گزارنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ وہاں سے چلی گئی۔ کامل کے اردگرد ویرانی چھا گئی۔ وہی دن تھے وہی راتیں، ہر طرف وہی گہما گہمی، سڑکوں پر آدمیوں کا وہی ہجوم، بازاروں میں وہی چہل پہل لیکن کامل کا دل بالکل خالی ہو چکا تھا۔ دردانہ کے مطالبے سے تنگ آ کر اس نے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔ قلم اس کے ہاتھ میں تھا اور احساس کا کرب قطرہ قطرہ لفظوں میں تبدیلی ہو رہا تھا۔

''دردانہ! جب تم میری زندگی میں آئیں تو میں نے خود کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب انسان سمجھا۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھا لیکن یہ صرف میرا خیال خام

تھا۔ ہمارے بیچ ایسا کوئی دلی لگاؤ تھا ہی نہیں جس پر ناز کیا جا سکتا۔ تم مجھ سے بیزار بیزار سی رہتیں۔ بارہا میں نے اپنے احساس کی کتاب تمھارے سامنے کھولنی چاہی، تمھاری توجہ اپنی طرف مبذول کرنی چاہی لیکن مجھ میں یہ وصف ہے ہی نہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لائق نہ تھے۔ اور آج بڑے دکھ سے مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں نے تمھیں اپنے قید و بند سے آزاد کر دیا ہے۔ اب تمھیں اپنی زندگی کی نئی شروعات میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے گی۔ میری دعا ہے کہ تمھاری ہر وہ خواہش، ہر وہ تمنا پوری ہو جسے میں پورا نہ کر سکا۔''

اس نے ایک سرد آہ بھری اور لفافہ بند کر دیا۔

یہ سنسنی خیز خبر برقی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے رشتہ داروں میں پھیل گئی۔ کسی نے افسوس کیا، کسی نے مذاق اڑایا لیکن وہ بہت ہی خوش تھی۔ اس نے جو چاہا تھا وہ اسے مل گیا تھا۔ اب شاہد اور اس کے بیچ کوئی تیسرا نہ تھا۔ اسے شاہد یا اس کے خط کا شدت سے انتظار تھا۔ لیکن ادھر سے مکمل خاموشی تھی۔ اس کی بے چینی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بہت انتظار کے بعد شاہد کا ایک مختصر سا خط آیا جس میں اس نے معذرت کر لی تھی کہ اس کے والدین ایک طلاق شدہ کو اپنی بہو بنانے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہیں۔

اس خبر سے اسے سکتہ سا ہو گیا۔ احساس زیاں نے اس کی طاقت گویائی اور ساری توانائی چھین لی تھی۔ زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ اس روز ساری رات وہ ایک پل کے لیے نہ سو سکی۔ اپنی ناعاقبت اندیشی پر آنسو بہاتی رہی اور شکوہ کرتی رہی۔

''شاہد! یہ کیا کیا تم نے؟ اتنی آسانی سے صرف دو لفظوں میں سارے ناطے سارے وعدے توڑ دیئے۔ کیا یہ محض ایک دل لگی تھی۔ مجھے میرے ہی نظروں میں اتنا حقیر بنا دیا۔ میرے اعتماد، میرے یقین کو کس قدر مجروح کر دیا۔ اب تم ہی بتاؤ

میں کیا کروں؟''

اسے ایک لمبی مسافت طے کرنی تھی ۔ راستہ پر پیچ تھا اور کوئی ہمسفر نہیں ۔ بہت دنوں تک وہ مایوسیوں کے حصار میں رہی ۔ پھر خود کو سنبھالا ، ماضی کو تقریباً بھلا دیا اور بادلِ نخواستہ ایک عمر رسیدہ شخص کو اپنا ہم سفر بنالیا۔ وہ ایک بزنس مین تھا۔ پہلی بیوی گزر چکی تھی ۔ اس نے عیش و آرام کی ہر ایک چیز اس کے قدموں کے نیچے ڈھیر کر دی لیکن اس کے پاس بیوی کے لیے وقت بہت کم تھا ۔ وہ ہفتوں بلکہ کبھی کبھی مہینوں اتنی بڑی کوٹھی میں کسی بے چین روح کی طرح بھٹکتی رہتی ۔ کسی پل اسے چین نہیں آتا۔ وہ سوچتی کہ جس زندگی کو پانے کے لیے اس نے کسی کے اعتماد کو توڑا ، دنیا کی نظروں میں بے وقعت ہوئی ، آج اُسی زندگی میں اس کوئی کشش محسوس نہیں ہورہی تھی ۔ ایک خلش تھی جو اسے بے چین رکھتی ۔ خلش جو بظاہر ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن اس کی کیفیت جب کسی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے تو سارے چین اور سکون چھین لیتی ہے ۔

یہ خلش اس وقت سے اور بڑھ گئی تھی جب لندن سے واپسی میں ایر پورٹ پر اتفاقاً کامل سے اس کی ملاقات ہوگئی تھی ۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ وہی لہجہ ، وہی سادگی ، وہی انکساری..... وہ کسی کی طرف سے بغض ، عداوت ، کدورت اور نفرت رکھنے والا نہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے وِش کیا۔ حال احوال پوچھا۔ اس کی خوشگوار زندگی پر اسے مبارک باد اور دعائیں دیں ۔ ادھر دردانہ کے اندر تو جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اس کے لیے کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ گئی ۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ہنوز وہیں کھڑا تھا اور اس کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطہ پر جمی تھیں ۔

دردانہ کے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی ۔

''تو کیا یہ شخص اب بھی اس کے دل میں براجمان ہے ۔ لیکن کیوں؟ وہ تو اس

سے بیزار تھی اور خود ہی اپنے لیے یہ راہ چنی ہے۔'' وہ مڑی اور بوجھل قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ تب سے وہ مسلسل سوچ رہی ہے کہ جو راہ اس نے چنی ہے وہ ایک سمجھوتہ ہے۔ ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس میں دل کے لگاؤ کا کوئی دخل نہیں۔ وہ لگاؤ، وہ بندھن کے دھاگے جو بہت ہی بیش قیمت اور معتبر تھے اسے تو وہ اپنے ہی ہاتھوں توڑ آئی ہے۔

اس نے ایک سرد آہ بھری۔

''کاش وہ سُراب کے پیچھے نہ بھاگتی۔ کاش خدا کی عنایت کردہ نعمت کو صبر وشکر سے قبول کرتی کاش، کاش، کاش۔''

☆☆☆

فیصلہ

وہ لڑکا بے تحاشہ دوڑ رہا تھا اور خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی اس کے تعاقب میں تو نہیں آ رہا ہے۔

گھبرایا ہوا وہ ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں چڑھ گیا اور خود کو لوگوں کے ہجوم میں چھپانے کوشش کرنے لگا۔ جب ٹرین چل پڑی تو وہ ایک برتھ کے کنارے ٹک گیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور آنکھوں میں خوف تھا۔ وہ تھوڑی دیر پر چونک کر اپنے اردگرد دیکھنے لگتا۔ سامنے والے برتھ پر ایک شخص کسی سے محو گفتگو تھا۔ جب دس بجے تو اس نے اپنا ٹفن نکالا اور کھانے میں مشغول ہو گیا۔

وہ لڑکا گاہے گاہے اس کی طرف دیکھ لیتا۔ اس شخص نے اندازہ لگایا کہ یقیناً وہ گھر سے بھاگ کر آیا ہے اور اب ضرور اسے بھوک ستا رہی ہوگی لہٰذا اس نے کھانے کی کچھ چیزیں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے کھانے کا اشارہ کیا جسے کچھ پس و پیش کے بعد اس نے قبول کر لیا اور تیزی کے ساتھ کھانے لگا۔ شاید وہ بہت ہی بھوکا تھا۔

دوسری صبح جب اس شخص کی منزل آ گئی اور وہ اپنا سامان سمیٹنے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ لڑکا بہت ہی بے چین ہے اور بار بار اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ شاید اسے

کسی سہارے کی تلاش تھی۔ ازراہ ہمدردی اس نے پوچھا۔

''لڑکے تمھیں کہاں جانا ہے؟'' لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گرنے لگے۔

''روؤ مت۔ میرے ساتھ چلو گے؟'' اس شخص کا دل لڑکے کے تئیں ہمدردی سے بھر گیا تھا۔ لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ اس واقعے کو کافی دن گزر گئے تھے لیکن اب تک اس نے اپنے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کا نام کامران ہے۔ ممی اسے پیار سے کامی کہتی تھیں۔ بہت کریدنے پر اس نے بتایا کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کا باپ کون تھا۔ وہ اپنی ممّی کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ بدقسمتی سے ایک حادثہ میں وہ بھی چل بسیں اور وہ بالکل تنہا رہ گیا۔ دوسرے دن سلیم نامی ایک شخص آیا اور اسے اپنے گھر لے گیا۔ اتنا بتا کر وہ خاموش ہوگیا اور خلا میں دیکھنے لگا۔ جیسے کچھ باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اب جو شخص اسے اپنے ساتھ لایا تھا اس کا نام رحمت علی تھا۔ وہ اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔ شاید یہ اس کے ماں باپ کی کسی نیکی کا صلہ تھا یا کوئی غیبی مدد ...... بہرکیف اسی کی زندگی پرسکون ہوگئی لیکن کبھی وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہوجاتا۔

جوں جوں وہ شعور کی منزلیں طے کر رہا تھا اس کے ذہن کے پردے پر بہت سی باتیں واضح ہوتی جارہی تھیں۔

وہ سوچتا یہ دنیا بھی کسی عجائب خانے سے کم نہیں جہاں طرح طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جہاں بے لوث محبتیں ہیں شفقتیں ہیں، ہمدردیاں ہیں۔ دوسری طرف ظلم وستم ہے، نفرت ہے، دھوکا ہے، فریب ہے، ریاکاری اور خودغرضی ہے۔ انھی خیالوں کے درمیان دو قہر برساتی آنکھیں اس کے تصور میں آکر اب بھی اسے سہما

جاتیں۔ وہ عورت یاد آتی جو اس کے محسن سلیم کی بیوی تھی اور جو شوہر کی غیر موجودگی میں اس پر ظلم وستم کا مظاہرہ کرتی۔ پورے ایک سال تک مار کھا کر، جھڑکیاں سن کر، نوکروں کی طرح خدمت کر کے اور فاقہ سہہ سہہ کر اس نے گزارا تھا۔ وہ واقعہ آج بھی اسے یاد تھا جس کے ڈر سے وہ بے تحاشہ بھاگا تھا۔ سلیم کی بیوی نے کسی غلطی پر اسے لوہے کی سلاخوں سے داغا تھا۔ یہ سب یاد کر کے اس کا دماغ پھوڑوں کی طرح دُکھنے لگتا۔ وہ ان اذیت ناک خیالوں سے چھٹکارا پانے کی حتی الامکان سعی کرتا اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

وہ بے حد ذہین تھا۔ خدا نے اسے ذہانت عطا کرنے میں بہت ہی فراخ دلی سے کام لیا تھا۔ خدا بڑا ہی منصف ہے۔ جب کسی سے کوئی چیز چھین لیتا ہے تو اس کے عوض کوئی بہتر چیز دے دیتا ہے۔ کامران کو اس نے اس دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ رحمت علی جلد ہی اس کی اس خوبی سے واقف ہو گئے اور اس کا داخلہ شہر کے ایک نامی گرامی اسکول میں کرا دیا۔

وقت اتنی تیزی سے گزر گیا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اب وہ جوان ہو چکا تھا اور ایک مشہور کالج میں زیر تعلیم تھا۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے وہ اپنے پروفیسرز اور اپنے کلاس فیلوز میں بہت ہی مقبول تھا۔ اس خوبی کے علاوہ وہ اپنی وجاہت کے باعث بھی بہت لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ رحمت علی کی اکلوتی بیٹی غزالہ تو اس کی گرویدہ تھی۔ مگر وہ ایک خاموش طبع، نیک فطرت اور حساس قسم کا لڑکا تھا۔ اسے اپنی حیثیت کا بھی بخوبی اندازہ تھا اس لیے اپنی طرف غزالہ کے بڑھتے ہوئے التفات سے خوف زدہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اُبھرتے ہوئے جذبے کامران کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ جذبے چاہے محبت کے ہوں یا نفرت کے..... خوشی کے ہوں یا غم کے یا انتقام کے آپ ہی آپ عیاں ہو جاتے ہیں۔ وہ رحمت علی کا شکر گزار

ضرور تھا جو اس کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوئے تھے اور اسے اس مقام پر پہنچایا تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہی کانپ جاتا کہ ان ہاتھوں کا سہارا نہ ملا ہوتا تو نہ جانے وہ اب تک کہاں کہاں بھٹک رہا ہوتا۔ وہ اپنے اس سہارے کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن غزالہ کے بڑھتے ہوئے قدم کو کیسے روکے، اسے کیسے سمجھائے کہ وہ تو ایک ادنیٰ سا انسان ہے..... ایک کنگال شخص ہے بلکہ اسی کی کوئی پہچان ہی نہیں ہے۔ اس کا ماضی تو اس کورے کاغذ کے مانند ہے جس پر پہچان کا ایک لفظ بھی ثبت نہیں۔

امتیازی نمبروں سے بی اے پاس کرنے کے بعد اس نے ایم اے میں داخلہ لے لیا اور یونیورسیٹی میں بھی اپنی پُرکشش شخصیت اور ذہانت کی وجہ سے مقبول ہو گیا۔ جب اس کا ایم اے کا رزلٹ آیا تو ہر بار کی طرح اس بار بھی اس نے پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کی اس شاندار کامیابی پر گھر کا ہر فرد گلے لگا کر مبارکباد دے رہا تھا اور وہ حیران تھا کہ یہ کیسا رشتہ ان کے بیچ استوار ہوا ہے جسے اب تک وہ کوئی نام نہ دے سکا ہے۔ لیکن یہ رشتہ سب رشتوں میں انمول اور معتبر تھا۔

ایک دن رحمت علی نے اسے طلب کیا۔ جب وہ ان کے کمرے میں داخل ہوا تو سلام کے بعد اس نے پوچھا۔

''انکل آپ نے مجھے یاد کیا ہے؟''

''ہاں بیٹا! آؤ بیٹھو۔ آج تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ دراصل ہم لوگ تمھاری اس نمایاں کامیابی پر بہت ہی خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ اب تمھاری شادی کر دیں۔'' انھوں نے بہت ہی بااختیار لہجے میں کہا۔

''اگر تم کہو تو کہیں تمھارے رشتہ کی بات کریں۔''

''لیکن انکل میں ابھی اور آگے پڑھنا چاہتا ہوں اور شادی کے بارے میں تو میں نے ابھی کچھ سوچا ہی نہیں ہے۔''

''کیوں آخراس کی وجہ؟''

''وجہ میں کیا بتاؤں سوائے اس کے کہ ابھی اور آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔''

''خیر جیسی تمھاری مرضی۔'' اتنا کہہ کر رحمت علی خاموش ہو گئے۔

جب وہ اپنے کمرے میں واپس آیا تو اس کا ذہن بہت ہی منتشر ہو چکا تھا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ اس کے دماغ میں شدید خلفشار مچا ہوا تھا۔ آخر کار کئی رات پیہم ذہنی کشمکش کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اب اسے یہاں سے کہیں دور چلا جانا چاہئے۔ جس شخص اس پر احسانوں بارش کی تھی اس کے لیے وہ پرابلم بننا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے رحمت علی کے نام ایک خط لکھا۔ خط مکمل ہو جانے کے بعد اسے بار بار پڑھا۔ ہر بار اندر سے یہی آواز آتی۔

''کیا ان مہربانیوں اور ان عنایتوں کا یہی صلہ ہے؟''

''نہیں! نہیں!!'' وہ چیخ اُٹھا۔

''اب یہ قدم کسی اور سمت نہیں اُٹھ سکتے کیونکہ یہ بے لوث محبت اور خلوص کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور محبت وہ رشتہ ہے جو سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے۔''

اس نے خط پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور اپنی قسمت کے فیصلے کو خدا کے سپرد کر کے مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

دوسرا ظلم

صبح سویرے کسی شور سے میری آنکھیں کھل گئیں حالانکہ رات دیر سے سویا تھااس لیے اتنے سویرے جاگنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔لیکن برا ہواس شور کا جس نے میری نیند کا ستیاناس کر دیا۔ میں ہڑ بڑا کر اُٹھا۔ پہلے کھڑکی کھول کر اطراف کا جائزہ لیا پھر دروازے سے باہر نکل کر واقعہ کی نوعیت جاننے کی کوشش کی۔ لوگ ٹولیوں میں بنٹ کر آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔

''کیا ہوا بھائی؟''میں نے دور ہی سے آواز لگائی۔

''وہ چھوکری بھاگ گئی۔''

''کون چھوکری؟ کس کی چھوکری؟''میں کچھ سمجھ نہ سکا۔

''ارے وہی اپنے اللہ رکھا کی بیٹی رحیمہ۔''

''اوہ تو رحیمہ بھاگ گئی؟''مجھے افسوس ہوا۔

وہ بہت دنوں سے میرے یہاں اپنی ماں کے ساتھ کام پر آتی تھی۔ گول مٹول گوری ناری پیاری سی لڑکی۔ عمر یہی دس گیارہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ جب آتی ہم لوگوں کے آگے پیچھے لگی رہتی۔ دوڑ دوڑ کر ہمارا کام کرتی۔ جب ہم لوگ پڑھتے رہتے تو

ہمارے پاس آکر بیٹھ جاتی۔ کبھی پیپر تو کبھی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھتی رہتی۔ ایک دن پڑھنے کے سے انداز میں بدبدانے لگی۔ اس کی معصومیت پر میں نے مسکرا کر پوچھا

''پڑھنا جانتی ہے رحیمہ؟'' اس نے دانت نکوس کر اثبات میں سر ہلایا۔ تبھی اس کی ماں کی کرخت آواز آئی۔

''ارے رحمنی کہاں مرگئی نامراد؟ چل آ۔ جلدی جلدی جھاڑو لگا۔ ابھی پونچھا لگانا باقی ہے اور لے ای برتن کو ریک پر سریا دے۔''

وہ جلدی جلدی اپنے ماں کے حکم کی تعمیل کرنے لگی۔ میں نے سوچا یہ کیسی ماں ہے کبھی سیدھے منہ اس سے بات نہیں کرتی۔ پھر خیال آیا یہ ماں کہاں باپ کی دوسری بیوی ہے۔ اسی طرح ڈانٹ ڈپٹ کھاتی ہوئی وہ جوانی کی طرف بڑھتی رہی۔ اور اب ایک بھرپور دوشیزہ بن چکی تھی۔ بہت ہی شاداب جیسے موسم بہار کی شگفتہ کلی جسے دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ حسن کسی خاص طبقے کی میراث نہیں۔ یہ تو خدا کا کرم ہے کہ جسے چاہے نواز دے۔ اسی لیے تو اکثر گودڑ میں لال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک دن جب وہ میرے یہاں آئی تو ماں اس کے ساتھ نہ تھی۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ماں کیوں نہیں آئی؟''

''ماں ایک جگہ اور کام پکڑلی ہے۔ اور کہے ہے کہ ایک تنخواہ میں دو جنے کام کریں گے تو پیٹ کیسے پوسائے گا۔''

اتفاق سے اس روز میں بھی تنہا تھا۔ میرے گھر والے کسی تقریب میں دو دنوں کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ فرصت نہ ملنے کی وجہ سے میں نہ جاسکا تھا۔ گھر کی تنہائی میں اس کی موجودگی نے میرے دل میں ہل چل سی مچادی تھی۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ میں بھی انسان تھا کوئی فرشتہ نہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔ میں نے کسی طرح خود کو سنبھالا اور اسے جلد سے جلد چلتا کیا۔

''جا! اماں کو بھیج دے یا جب میرے گھر والے آجائیں گے تب آنا۔''اس کے جانے کے بعد میں نے چین کی سانس لی ایک بہت بڑا طوفان آتے آتے رہ گیا تھا۔

اب رحیمہ کئی گھروں میں کام کرنے لگی تھی۔اس کے رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے۔بڑے ہی ٹھسّے سے رہتی۔چست اور بھڑ کیلے لباس پہنتی۔غازہ پاؤڈر سے لپی پتی ہوتی۔کھلے بال کبھی شانوں پر لہراتے اور کبھی پونی ٹیل کی صورت میں ہوتے۔راستے میں جب منچلے اسے چھیڑتے تو وہ ایک ادائے دلربائی سے مسکراتی۔پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتی۔اب میرے یہاں وہ شاید باید ہی آتی۔جب آتی تو بڑا''میں،تو' جھاڑتی۔ تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا جس سے چہرے پر چمک آگئی تھی اور ادا ایسی کہ بڑے بڑے عابد وزاہد کا ایمان متزلزل ہو جائے۔میں نے کہا۔

''رحیمہ! اماں سے کہہ کہ اب تیری شادی کر دے۔''اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا اور آنکھوں میں اُداسی چھا گئی۔

''پھر گھر کا خرچہ کیسے چلے گا بھیا۔'' وہ مایوسی سے بولی۔اور میں سوچنے لگا کہ کوئی انسان بنیادی طور پر برا اور بدکار نہیں ہوتا۔ حالات اسے کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔اب اس کی ذات مشکوک ہوتی جا رہی تھی۔اکثر لوگ اسے تنہائی میں کسی سے ملتے اور باتیں کرتے دیکھتے۔محلّے کی بدنامی کے خیال سے کئی لوگوں نے اس کے باپ سے کہا۔

''اب بیٹی جوان ہو گئی ہے جلد اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔''لیکن اس کے باپ کی غیرت مر چکی تھی۔وہ پہلے بھی نشہ کرتا تھا اور اب جب بیوی بیٹی چھوٹ کر کمانے لگی تھیں تو اس نے بھی چھوٹ کر پینا شروع کر دیا تھا۔اسے کچھ ہوش نہ تھا کہ بیٹی کیا کرتی ہے،کہاں جاتی ہے،کہاں رہتی ہے۔

ایک دن رحیمہ پریشان حال میرے گھر آئی۔ چہرہ سیاہ، ہونٹوں پر پپڑی پڑی تھی۔ آتے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟؟'' لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔

''تین دن سے ماں، ہمکو گھر میں بند کیے تھی۔'' اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔

''کس جرم میں''۔

''اُو ایک لڑکا ہم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''اور تو کیا چاہتی ہے؟''

''ہم بھی اسے پسند کرتے ہیں مگر ماں کو منظور نہیں۔ جب لوگ مجھ پر بری نظر ڈالتے تھے، مجھے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنانا چاہتے تھے تو ماں جان کر انجان بنی تھی اور اب۔ وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

''اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی ضرور۔ ہوسکتا ہے وہ لڑکا ناکارہ اور آوارہ ہو۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' وہ بھڑ گئی۔

''صوم صلواۃ کا پابند ہے وہ۔ دوسرے محلّے میں اس کی اپنی دوکان ہے۔ آپ ہی ذرا ماں کو سمجھائیے۔''

''ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا۔'' میں نے اسے تسلی دی اور وہ مطمئن ہو کر واپس چلی گئی۔ لیکن جب اس کی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ایک دم طیش میں آ گئی۔ اسے برا بھلا کہنے لگی۔ یہاں تک کہ گالی گلوج پر اُتر آئی۔

''حرام جادی، رنڈی، چلی ہے بیاہ رچانے۔ کتنا پیسہ جمع کر کے رکھی ہے؟'' اس کے تیور دیکھ کر مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔ پھر بہت دنوں تک اس کا کچھ اتہ پتہ نہ چلا۔ شاید ناامید ہو کر رحیمہ خاموش ہو گئی تھی کہ اچانک یہ خبر پورے محلّے میں پھیل گئی۔ ممکن ہے اس ناگوار

واقعہ کو ایک حادثہ سمجھ کر اس کے ماں باپ خاموش ہو جاتے لیکن سونے کے انڈا دینے والی مرغی کو کون چھوڑتا ہے۔ کس طرح ڈھونڈ، ڈھونڈ، کر اسے نکال ہی لیا گیا۔ وہ سنگی مجسّمے کی طرح پنچایت کے بیچ بت بنی کھڑی تھی اور ہر طرف سے سوالوں کی بوچھار تھی۔ بہت دیر بعد اس نے منہ کھولا۔

''ایک جُلم اُوتھا جو اَب تک ہم جھیلتے آرہے تھے اور دوسرا جُلم یہ ہے جب پھر مجھے اس نرک میں لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔

☆☆☆

زمین سے آسمان تک کا سفر

جب اس نے بتایا کہ ایک پاش ایریا میں اس نے بنگلہ خرید لیا ہے تو میں حیران رہ گیا۔

''کیا تمھیں الہٰ دین کا چراغ مل گیا ہے؟ اتنے کم عرصہ میں کسی کے پاش ایریا میں بنگلہ خریدنا کسی چمتکار سے کم نہیں۔''

''یہی سمجھ لیجیے۔'' خوشی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

''دیکھو کسی کام میں سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا۔'' میں واقعی متفکر تھا۔

''کیا آپ مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہیں؟''

''نہیں تمھاری عقلمندی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی چیز کی زیادتی بھی کبھی انسان کو لے ڈوبتی ہے۔''

''ایسا کچھ نہ ہوگا۔ آپ فکر نہ کیجیے۔''

وہ کچھ نہ کچھ بولتا رہا اور میں تصور کی آنکھوں سے اس کے بنگلے کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس وقت کو یاد کر رہا تھا جب ابا ایک لڑکے کا ہاتھ تھامے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

''ریحان دیکھو بیٹا! تمھارے لیے ایک بھائی لایا ہوں۔ انھوں نے مجھے آواز دی اور میں اس نعمت غیر متوقع پر کھل اٹھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر اسے گلے سے لگا لیا۔ پھر ہم

ساتھ رہنے لگے۔ ساتھ کھیلتے ساتھ پڑھتے۔ وہ ابا کا کچھ زیادہ ہی چہیتا بن گیا تھا۔ اگر کسی دن وہ اسے نہیں دیکھتے تو ایک ایک سے پوچھتے ''افلاطون کہاں ہے؟'' یہ نیا نام بھی ابا ہی کا دیا ہوا تھا۔ اور بالکل صحیح دیا گیا تھا۔ وہ تھا ہی بقراط سقراط قسم کا انسان۔ ہر فن مولی۔ جو کام کسی سے نہ بن پاتا وہ چٹکیوں میں کر گزرتا۔ باتیں بنانے اور لوگوں کو خوش کرنے کا فن اسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ صرف ابا ہی نہیں گھر کا ہر فرد اس سے خوش رہتا۔ اور ہمیں تو کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ اس سے ہمارا کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے۔ وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا یہ جاننے کی ہم نے کبھی کوشش نہ کی اور نہ کبھی ابا نے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔

وقت گزرتا رہا اور ہم اسکول سے کالج پہنچ گئے۔ اس نے اچھا خاصا قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ تیزی طراری میں کچھ اور ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ہر جگہ ہر موقع سے اپنے نام کے ساتھ افلاطون کا دم چھلا لگانا نہیں بھولتا جیسے پی ایچ ڈی ہولڈر اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگانا نہیں بھولتے۔ گویا ابا کی طرف سے ملا ہوا یہ ایک بڑا اعزاز تھا۔ اس کی ظاہری شخصیت بھی بہت پر کشش تھی۔ گورا رنگ، اونچا قد، کشادہ روشن آنکھیں اور مسکراتا ہوا چہرہ۔ جب وہ بن ٹھن کر گھر سے نکلتا تو لوگ سمجھتے کوئی رئیس زادہ جا رہا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کا دوسرا اور اہم پہلو بہت ہی مایوس کن تھا۔ ذہین فطین ہونے کے باوجود وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکا تھا۔ دوستی کرنے میں وہ بڑا تیز تھا۔ زیادہ تر باہر ہی رہتا۔ جس کے لیے اکثر اس سے باز پرس بھی کی جاتی۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے کچھ کرنے یا کچھ بننے کی چاہ نہ تھی یا وہ نکما اور بے حس تھا۔ لیکن کچھ کرنے کچھ بننے میں صبر و تحمل، ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ تو راتوں رات کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ سیدھا راستہ چھوڑ کر شارٹ کٹ سے منزل تک پہنچنا چاہتا تھا جیسے اسے کہیں سے الہٰ دین کا چراغ ہاتھ لگ گیا ہو جسے گھستے ہی حکم کی تعمیل کے لیے جن حاضر ہو جائے گا اور خیر یہ تو میرا

قیاس تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے ارادے کا بہت ہی پکا تھا۔ اپنے خوابوں کی تعمیر پانے اور اپنے ارادوں کو پورا کرنے کے لیے اس نے ہاتھ پانو مارنا شروع کر دیا۔ وہ کہتا معاشرے میں عزت و شہرت دولت سے ملتی ہے اور دولت اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے چھلانگیں لگانی پڑتی ہیں ورنہ کیڑے مکوڑے کی طرح ساری زندگی رینگتے رہیے اور مجھے رینگ رینگ کر منزل تک پہنچنا گوارا نہیں۔ وہ سارا سارا دن غائب رہتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی دنوں تک نظر نہ آتا۔ ایک دن اسے دیکھ کر میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔

"تمھاری پرورش میں کہاں کی کھوٹ رہ گئی تھی کہ تم اتنے خودسر اور خودمختار بن بیٹھے ہو"۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایسا نہ کہیے۔ دراصل میں نے ایک کام شروع کیا ہے جس میں دن رات مصروف ہوں اور بے وقت کی آمدورفت سے میں آپ لوگوں کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا۔"

"آخر کون ایسا کام ہے ہمیں بھی تو بتاؤ۔" لیکن وہ باتوں کو گول کر جاتا۔ تفصیل بتانے سے گریز کرتا اور آج بنگلہ خریدنے کی خبر دے کر تو اس نے ایک دھماکہ کر دیا تھا۔ اس دھماکے کی زد میں آکر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کافی دیر کے بعد اس کی آواز پر چونک کر میں اس پاتال سے باہر نکل آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں اپنے بنگلہ میں شفٹ ہو جاؤں۔" دل چاہا اسے روک لوں کہ بیس سال ہم نے ایک ساتھ گزارے تھے۔ اپنی ہر خوشی، ہر غم ایک ساتھ منایا تھا۔ لیکن اب یہ ممکن نہ تھا۔

"جب تم نے الگ ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ ہر بات سے ہمیں لاعلم رکھا تو اب اجازت لینے کی کون سی تک ہے۔" میں نے دکھے دل کے ساتھ کہا۔ اس کے جانے کے

بعد گھر ہی میں نہیں میرے دل میں بھی ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔ دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ وہ ہم سے جدا ہو گیا۔ دکھ تو یہ تھا کہ اس نے ہمیں قابل اعتبار، قابل بھروسہ نہ سمجھا۔ اپنا معاملہ ہم سے شیئر نہ کیا۔ ہاں اتنی مہربانی ضرور کی کہ گاہے گاہے ہم سب سے ملنے کے لیے آکر سعادت مندی اور نمک حلالی کا ثبوت دے جاتا۔ پھر دھیرے دھیرے یہ بھی ختم ہو گیا۔ اس سے رابطہ ہی ٹوٹ گیا کیونکہ اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ ایک علاقے سے دوسرے اور پھر تیسرے علاقے میں منتقل ہوتا رہتا۔ لیکن اکثر لوگوں نے اسے بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومتے اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں بڑی بڑی پارٹیوں سے بزنس ڈیل کرتے دیکھا تھا۔ پھر اچانک یہ خبر ملی کہ وہ بالکل قلاش ہو کر ایک روم کے فلیٹ میں آ گیا ہے۔

''یہ کیا ہو گیا؟'' میں نے دکھ سے سوچا۔ اس وقت کتنی خوشی ہوئی تھی جب ہم نے سنا تھا کہ اس نے بلب کی فیکٹری لگائی ہے۔ اس کا مال باہر بھی جاتا ہے۔ کسی صورت سے اس نے پرمٹ حاصل کر لیا ہے۔ اور وہ کامیابیوں کے آسمان کو چھو رہا ہے۔ پھر یہ اچانک چاروں شانے چت زمین پر کیسے آ گرا۔ میرے کانوں میں خطرے کی بجنے لگی۔ ایک دن صبح سویرے میں پیپر پڑھ رہا تھا کہ موٹے حروف میں لکھی ہوئی اس خبر نے مجھے چونکا دیا۔

''ذاکر حسن عرف افلاطون کالے دھندے میں ملوث ہونے کے الزام میں اپنے گروہ کے ساتھ پولس کی حراست میں۔''

تو یہ تھا راتوں رات زمین سے آسمان تک کے سفر کا راز۔

☆☆☆

نقار خانہ

''اللہ کے نام پر دے دے بابا!''

''بچوں کا صدقہ دے دے بابا!''

''تیرا بھلا ہو ایک ڈالر دے دے بابا!''

حاجی علی کے روضہ کی طرف جاتے ہوئے یہ صدائیں مسلسل میرا پیچھا کر رہی تھیں۔

میں پیالہ میں پانچ کا سکہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ روضہ جانے والے راستے کے دونوں طرف قطار سے بیٹھے ہوئے ان لوگوں کی تعداد تقریباً پچیس تیس ہوگی اور ظاہر ہے کہ میں ہر ایک کے پیالہ میں پانچ کا سکہ تو نہیں ڈال سکتا تھا۔

''یہ کیا دے گا' یہ تو خود ہی فقیر ہے بیچارہ ہندوستانی۔'' یہ آواز گولی کی طرح میری سماعت کے پردے پر لگی اور برچھی کی طرح میرے دل میں پیوست ہوگئی۔ بیچارہ ہندوستان ..... جس کی شان کے قصے تواریخ میں موجود ہیں۔ شاعر نے جس کی شان میں قصیدے لکھے۔ جہاں اولیاء نے اپنی کرامات دکھائیں۔ جہاں کوئی غریب نہ تھا۔ ہر ایک قناعت کی دولت سے مالا مال تھا۔ تب زندگی کی رفتار اتنی تیز نہ تھی اور اب تو یہ حال ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی دوڑ میں لہولہان ہو رہا ہے۔ چھینا جھپٹی میں خون کی ندیاں بہا رہا ہے۔

ہر طرف ظلم وستم کا بازار گرم ہے۔ اگر لوگوں میں ذرا بھی عقل ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔ بیچارہ ہندوستان.....لیکن اس کا ذمہ دار کون ہے؟ خود یہی لوگ اگر یہ آپس کی نفرت کو مٹا کر یکجہتی کے ساتھ ملک کی فلاح و بہبود کے لیے جٹ جاتے تو آج نہ تو ہندوستان بیچارہ ہوتا نہ ہندوستانی۔ لیکن لوگوں کا ضمیر تو مردہ ہو چکا ہے۔ جانے اس ملک کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

اے بزرگان دین و دنیا اٹھو جاگو دیکھو تمھاری اس پاک سرزمین پر یہ کیا کیا ہو رہا ہے کوئی معجزہ تو دکھاؤ۔

جب باہر آیا تو دیکھا دو بھکاری زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے لیے اس طرح لڑ رہے تھے جیسے دو کتے آپس میں چھیچھڑے کے لیے لڑتے ہیں۔

''ابے سالے! یہاں پر سے اپنا قبضہ ہٹا ورنہ۔''

''کیا یہ تیرے باپ کی جاگیر ہے؟''

''ہاں میرے باپ کی جاگیر ہے اور یہ جگہ میں نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دی ہے۔ کل سے میرا داماد یہاں پر اڈہ جمائے گا اور ڈالر کمائے گا۔''

''ڈالر کمانے کی ایسی کی تیسی۔ دیکھتا ہوں کیسے اڈہ جماتا ہے۔''

پھر دونوں میں ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ میں حیرت سے کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ دل میں آ رہا تھا کہ کہہ دوں کہ ارے نادانو! کیوں جھگڑتے ہو؟ جھگڑا ابھی کسی مسئلہ کا حل ہے؟ جو چیز تمھاری ہے اسے تو سنبھال کر رکھو۔ کہیں تم دونوں کے جھگڑے میں کوئی تیسرا طاقتور آ کر اس جگہ کو بھی نہ ہڑپ کر جائے جس جگہ پر کھڑے ہو کر تم غرور سے سینہ تان کر لڑ رہے ہو۔

لیکن میں خاموش رہا کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟

☆☆☆

(شاعر، فروری ۰۳)

BALADAST
(SHORT-STORIES)
by
NAUSHABA KHATOON

SALIS PUBLICATIONS
Shah Colony Shah Zubair Road Munger 811201
Phone : 06344-224585, (0)9430667003, (0)9934680193
E-mail:salisafaque@yahoo.in
Website: www.welcometomunger.ning.com